معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر
بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷/اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 — Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، چک بھیجنے کی صورت میں پچاس روپے مزید ارسال کریں، چک یا بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

☆ DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہنچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا، رقم پیشگی آنی چاہیے۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر۔ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۸ ماہ ذی قعدہ ۱۴۲۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۰۶ء عدد ۶

فہرست مضامین

ای میل : email: shibli_academy@rediffmail.com

شذرات

آزادی کے بعد روز بہ روز مسلمانوں کے حالات بدتر اوران کے مسائل پیچیدہ تر ہوتے گئے، کانگریس بلاشرکت غیرے ملک کے سیاہ وسفید کی مالک رہی، کچھ عرصے تک دوسرے بھی اقتدار پر فائز ہوئے مگر مسلمانوں کے دن نہ پھرے، ۶۰ برس کے طویل عرصے میں ان کے سروں سے جوئے خوں ہی گزرتی رہی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری حکومتوں اوران کی انتظامی مشنریوں نے ان کو آگے نہ بڑھنے، پیچھے کرنے اور نیچے گرانے پر ایکا کرلیا تھا، انہیں اپنے عقیدہ و مذہب سے برگشتہ کرکے ان کا بھارتیہ کرن کرنے اور ان کی مساجد و آثار کو مٹانے کی منظم کوششیں کی گئیں، ایسے ہول ناک فساد ہوئے کہ مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو اور روزی روزگار سب تباہ ہوگئے اوران کا آنسو پوچھنا تو درکنار انہیں جیلوں میں ڈال کر ذہنی و جسمانی اذیتیں دی گئیں اور فرضی مقدمات میں پھنسایا گیا، پولس اور انتظامیہ نے اصل مجرموں پر آنچ تک بھی نہیں آنے دی، اکثریت آزادی کی برکتوں سے متمتع ہوتی رہی اور مسلمانوں کو بھوکا، ننگا کرکے ہاتھوں میں کاسۂ گدائی لینے پر مجبور کردیا گیا، بالآخر وہ دن بھی آگیا کہ ملک میں بی جے پی کی سربراہی میں حکومت قائم ہوگئی اوراس نے پورے ملک کو بھگوا رنگ میں رنگ دینا چاہا۔

پارلیمنٹ کے گزشتہ انتخابات میں غیر متوقع طور پر این ڈی اے کو شکست اور کانگریس کو کئی پارٹیوں سے مل کر حکومت بنانے میں کامیابی مل گئی تو سمجھا جانے لگا کہ فرقہ پرستی کا زور کم ہوگیا ہے اور اب بی جے پی دوبارہ نہیں ابھر سکے گی، اس پر خود بھی پژمردگی چھاگئی تھی اور اس کے اندرونی اختلافات ابھر کر سامنے آنے لگے تھے مگر جلد ہی خود سیکولر پارٹیوں میں بھی کشمکش شروع ہوگئی اور بہار میں ان کے ووٹوں کی تقسیم سے این ڈی اے کی حکومت بن گئی جس میں بی جے پی دوسری بڑی پارٹی کی حیثیت سے شریک ہے، حال میں اترپردیش کے بلدیاتی انتخابات میں بھی سیکولر پارٹیوں کا اختلاف رنگ لایا اور بی جے پی کا مرجھایا ہوا چہرہ تروتازہ ہوگیا، سیکولر کہلانے والی پارٹیوں کے اسی رویے کی بنا پر چھ سال تک ملک کی باگ ڈور بی جے پی کے ہاتھ میں چلی گئی تو اس نے جی بھر کے خوب گل کھلایا اور اقتدار اس کے منھ کو لگ گیا، اب اترپردیش کے انتخابات سرپر آگئے ہیں اور سیکولر

پارٹیاں تو لڑ بھڑ رہی ہیں مگر بی جے پی اترپردیش پر قبضہ کرنے کا پلان بنارہی ہے، اگر وہ اس میں کامیاب ہوجاتی ہے تو اس کا خمیازہ ریاست ہی کو نہیں ملک کو بھی بھگتنا پڑے گا مگر اس کی ساری ذمہ داری سیکولر پارٹیوں کی ہوگی جن کو ان کی خود غرضی اور اقتدار کی ہوس نے باؤلا کردیا ہے، تاہم سیکولر لوگوں کو بھی سوجھ بوجھ سے کام لے کر فرقہ پرستوں کو روکنا اور ان لوگوں سے ہوشیار رہنا چاہیے جو عین انتخاب کے وقت ان کے ووٹ تقسیم کرنے کے لئے نمودار ہوجاتے ہیں۔

کانگریس کی سربراہی میں جب یو پی اے نے حکومت بنائی تو لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور خود حکومت نے ایسا رنگ ڈھنگ دکھایا کہ معلوم ہوتا تھا کہ جمہوریت اور سیکولرزم پر منڈلاتے بادل چھنٹ جائیں گے، مسلمان بھی خوش تھے کہ بھٹکی ہوئی کانگریس اب راہ راست پر آکر ماضی کی غلطیوں کی تلافی کرے گی، ظلم، زیادتی اور ناانصافی ختم ہوجائے گی اور ان کے ساتھ امتیاز اور دوہرا برتاؤ نہیں ہوگا لیکن اولاً تو ماحول نہایت بگڑ گیا تھا اور فضا ایسی مسموم ہوگئی تھی کہ دردمند، مخلص اور انصاف پسند لوگوں نے اصلاح کی جو تھوڑی بہت کوشش کی بھی تو وہ بے نتیجہ رہی، ثانیاً بیوروکریسی کی رگ و ریشے میں فرقہ پرستی، تعصب اور بدعنوانی سرایت کرگئی ہے، اس لیے اس نے حکومت کی مفید اسکیموں کو بھی اپنی رخنہ اندازی سے کامیاب نہیں ہونے دیا، ثالثاً خود کانگریس میں آزادی سے پہلے والا ایثار و قربانی کا جذبہ مفقود ہوگیا ہے اور کانگریسی پاک دامن، کھری اور بے داغ سیکولر پالیسی پر چلنے اور مسز سونیا گاندھی کی طرح اقتدار کو پائے حقارت سے ٹھکرانے والے نہیں رہے اور جب نیتیں ٹھیک نہ ہوں تو کوئی اچھا اٹھا ہوا قدم آگے نہیں بڑھتا، یہی وجہ ہے کہ یو پی اے حکومت کے بعض مفید اقدامات بھی تعطل اور سرد مہری کا شکار ہوگئے اور حق و انصاف اور سیکولرزم کا سورج ابھی تک کہر کی تہہ میں چھپا ہوا ہے۔

وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے غالباً پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی اور سماجی حالت سے متعلق قابل اعتبار اعداد و شمار حکومت کے پاس موجود نہیں ہیں، اس لئے انہوں نے دہلی ہائی کورٹ کے سابق جسٹس راجندر سچر کی سربراہی میں ایک سات رکنی کمیٹی تشکیل دی، یہ بڑا لائق تحسین اقدام تھا، جسٹس راجندر سچر اوران کے رفقا بھی قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے پوری دیانت داری، قابلیت اور بڑی محنت و جاں فشانی سے یہ رپورٹ تیار کی، کئی

ریاستوں اوران کے بڑے شہروں کا دورہ کیا، جھگی جھونپڑیوں میں بھی گئے اورامکان بھر صحیح اعدادو شمار جمع کیے اور بڑی گہرائی سے واقعات کے تمام گوشوں اور پہلوؤں پر نظر ڈالی اور صحیح معلومات فراہم کرنے اور حقائق کو سامنے لانے میں کوئی کور کسر نہیں چھوڑی، اس سے پہلے کی کمیٹیوں اور کمیشنوں کو توسیع پر توسیع دی جاتی رہی ہے پھر بھی ان کی رپورٹ مکمل نہیں ہوتی تھی لیکن سچر کمیٹی کو رپورٹ تیار کرنے کا کام گزشتہ مارچ میں سپرد کیا گیا تھا اور اس کی میعاد میں صرف ایک بار توسیع ہوئی اور اس نے دوسری میعاد کے اندر ہی اپنی مکمل اور جامع رپورٹ وزیراعظم کے حوالے کردی، اس لحاظ سے بھی کمیٹی قابل تعریف ہے۔

رپورٹ وصول کرتے ہوئے وزیراعظم نے اعلان کیا کہ یہ پارلیمنٹ میں بحث کے لئے پیش کی جائیگی اور اس پر اتفاق رائے حاصل کر کے مسلم کمیونٹی کا جامع پروگرام تیار کیا جائے گا، خدا کرے ایسا ہی ہو ورنہ عموماً کمیشن اور کمیٹیوں کی رپورٹ سردخانوں میں ڈال دی جاتی رہی ہے لیکن وزیراعظم سچر کمیٹی کے بارے میں جس طرح اظہار خیال فرماتے رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی حکومت مسلمانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے واقعی فکرمند ہے، اپنوں اور غیروں کی پیدا کردہ مشکلات اور بیوروکریسی ان کی راہ کا سنگ گراں ہیں، سب سے بڑھ کر مسلمانوں کا انتشار اور عدم صلاحیت ہے جس سے وہ جیتی ہوئی بازی بھی ہار جاتے ہیں، پارلیمنٹ میں اس کی مخالفت کے لئے بی جے پی پہلے سے تیار بیٹھی ہے، رپورٹ کے مندرجات اخباروں میں قارئین کی نظروں سے گزر چکے ہوں گے، دراصل یہ مسلمانوں کی ہر قسم کی پس ماندگی اور ذلتوں سے بھی بدتر حالت کی ایک دستاویز ہے، اس میں سب سے برا حال مغربی بنگال کے مسلمانوں کا بتایا گیا ہے جہاں تین دہائیوں سے بایاں محاذ کی حکومت ہے، سچر کمیٹی کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ اگر کسی میدان میں مسلمان آگے ہیں تو وہ جیل خانے ہیں، ۳۰ فیصدی سے زیادہ عام ریاستوں میں اور دہلی و ممبئی جیسے بڑے شہروں میں ۳۵ اور ۴۰ فیصدی مسلمان جیلوں میں ہیں گویا اپنی آبادی سے دوگنا مسلمان جیلوں میں ہیں، ماہرین کے خیال میں اس کے لئے عدلیہ اور پولس کا متعصبانہ رویہ ذمہ دار ہے۔

☆☆☆☆☆

مقالات

صحفِ صدیقی اور حضرت مروان امویؓ

از:- پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی☆

رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کے مشورے پر خلیفہ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جنگ یمامہ (۱۲/ ۶۳۳ء) کے معاً بعد قرآن مجید کے منتشر اور بکھرے ہوئے تحریری سرمایہ کو کاتب نبوی حضرت زید بن ثابت خزرجیؓ کے ذریعہ ایک جگہ جمع کرایا، امام بخاری اور دوسرے محدثین کرام کے علاوہ متعدد دوسرے ماہرین فن کے مطابق عہد نبوی میں قرآن مجید کی تمام آیات کریمہ حرف بہ حرف لکھی ہوئی تھیں مگر وہ مختلف چیزوں، چھال، کاغذ، پتھر کی تختیوں، اونٹ کی ہڈیوں وغیرہ پر لکھی ہونے کے سبب بکھری ہوئی تھیں، ان کے علاوہ زبانی طور پر پورا قرآن مجید بہت سے باصفا سینوں میں بھی موجود تھا، امام زرکشی نے ایک اہم بات یہ کہی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں پورا قرآن لکھا ہوا تو تھا مگر ایک مصحف میں جمع نہیں تھا۔ (البرہان فی علوم القرآن، مصر، ۱۹۵، ۱/ ۲۳۵)

احادیث و روایات کے مطابق حضرت زید بن ثابتؓ نے اس پہاڑ جیسے کارِ عظیم کو مختصر مدت میں اوراق و قراطیس پر جمع کردیا، ظاہر ہے کہ ان میں کاغذ (اوراق) کے علاوہ دوسری چیزوں پر جو آیات قرآنی لکھی ہوئی تھیں، ان کو انہوں نے اپنے قلم سے کاغذوں پر لکھا تھا، ابھی تک کی معلومات کے مطابق ان ہی کی تن تنہا ذات گرامی نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا، روایات میں کہیں سراغ لگتا ہے نہ کوئی قرینہ پایا جاتا ہے کہ ان کے اس کارعظیم میں کچھ معاونین بھی تھے لیکن امکان بہرحال ہے جیسا کہ امام ابن ابی داؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ املا کا کام

☆ ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔

حضرت ابی بن کعب نے کیا تھا اور کتابت متعدد اشخاص نے کی تھی اور حضرت زید نے مراجعہ کیا تھا، امام بخاری کی حدیث :۴۹۸۶ میں صرف ان ہی کی کاوش کا ذکر خیر ہے، حافظ ابن حجر وغیرہ نے بھی اپنی تشریح میں کسی مدد کا حوالہ نہیں دیا۔ (کتاب فضائل القرآن، ۳-باب جمع القرآن، فتح الباری ،۹/ ۱۴-۱۵اور ۱۸-۲۱ بالخصوص البرهان ،۱/ ۲۳۳-۲۳۵، کتاب المصاحف ،۹ کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابی بن کعبؓ نے املا کرایا اور متعدد اشخاص نے قرآن کو لکھا اور ایک مصحف میں جمع کردیا)

حدیث نبوی میں ان کو ''صحف'' (صحیفوں) کا نام دیا گیا ہے اور حافظ ابن حجرؒ کی تشریح کے مطابق وہ اوراق پریشاں (الاوراق المجردۃ) تھے، مصحف اور صحف کا فرق بتاتے ہوئے حافظ موصوف نے لکھا ہے کہ مصحف تو سورتوں کی ترتیب رکھتا ہے اور بہ شکل کتاب ہوتا ہے کہ جب کہ صحف اوراق پریشاں ہیں جن میں سورتیں ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ پیوست تھیں (......أن الصحف الاوراق المجردة التی جمع فیها القرآن فی عهد ابی بکر وکانت سورا مفرقة ، کل سورة بآیاتها علی حدة لکن لم یرتب بعضها اثر بعض ، فلما نسخت و رتب بعضها إثر بعض صارت مصحفا...... فتح الباری ۹/ ۲۴) یہی ''صحف صدیقی تھے، حافظ ابن ابی داؤد نے ''صحف'' میں جمع کرنے کی روایت بھی دی ہے، (کتاب المصاحف ،۲۳:...... فنسخ تلك الصحف فی المصاحف فبعث بها الی الامصار) امام بخاری کے برخلاف عام روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے قرآن مجید کو مصاحف میں اور لوحین کے درمیان جمع کیا تھا جیسا کہ متعدد روایات کتاب المصاحف وغیرہ میں ملتا ہے:...... فانه اول من جمع بین اللوحین ...... جمع المصاحف (حافظ ابوبکر عبداللہ بن ابی داؤد سلیمان بجستانی م ۳۱۶/ ۹۲۸، کتاب المصاحف طبعہ رحمانیہ مصر ۱۹۳۶ء، (مرتبہ آرتھر جیفری) ۵-۶، نیز ۹-۱۰، لفظ ''کتب'' بھی استعمال ہوا ہے) حافظ ابوبکر عبداللہ نے بعد میں امام بخاریؒ کی نقل کردہ حدیث بھی اپنی سند سے پیش کی ہے جو دو تین سندوں سے مروی ہے اور اس میں صحف ہے (۶-۹)۔

ان کو صحف صدیقی کہنا اس لیے بھی مناسب و موزوں معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ وقت کے حکم سے قرآن کریم کو اوراق و قراطیس میں جمع کرکے محفوظ کردیا گیا تھا، بعض روایات میں ان کو صحیفہ بھی کہا گیا ہے لیکن واحد بول کر جمع مراد لیا گیا ہے، دوسری تاریخی اور واقعاتی سند یہ ہے کہ انہیں ''صحف صدیقی'' کی بنا پر حضرت عثمان بن عفان امویؓ کے عہد خلافت میں مصحف اور مصاحف تیار کیے گئے تھے جن کی تعداد مختلف روایات میں مختلف آئی ہے لیکن سات مصاحف کی روایت کو سب سے معتبر کہا گیا ہے اور ان مصاحف کو حضرت عثمانؓ کے نام نامی سے موسوم کرکے ''مصاحف عثمانی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

''صحف صدیقی'' سرکاری دستاویزات تھیں لہذا خلیفہ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس رہے، ان کی وفات کے بعد وہ ''صحف صدیقی'' ان کے جانشین خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ کی تحویل میں آئے کہ خلافتی میراث تھے، روایات کے مطابق حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد وہ ام المومنین حضرت حفصہ بنت فاروقؓ کی تحویل میں چلے گئے، یہ خاصی تعجب انگیز بات ہے کیوں کہ وہ حضرت عمرؓ کی ذاتی میراث نہ تھے کہ ان کے بعد ترکہ ان کی دختر بلند اختر کو پہنچتا، توجیہ یہ کی گئی ہے کہ حضرت عمرؓ کی وصیت کے سبب وہ حضرت ام المومنین کی تحویل میں آئے گئے تھے۔

غالبًا اس کا سبب یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کی زندگی میں ان کے جانشین - خلیفہ سوم - کا انتخاب نہیں ہوسکا تھا، لہذا تیسرے خلیفہ کے انتخاب تک ان کی حفاظت کے سبب حضرت حفصہؓ کے حوالے ان کو کردیا گیا، حیرت انگیز بات ہے کہ حضرت عثمان بن عفانؓ کی جانشینی اور بہ طور خلیفہ سوئم تقرری کے بعد بھی وہ ''صحف صدیقی'' انہیں ام المومنین کی تحویل میں رہے اور خلیفہ وقت و حاکم امیر المومنین کو وہ اہم ترین سرکاری دستاویزات نہیں دی گئیں اور بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ام المومنین سے ان کا مطالبہ بھی نہیں کیا، یہ ابھی تک ایک تاریخی گتھی ہے جو حل کی طالب ہے۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے مصاحف عثمانی لکھوانے کے لیے حضرت حفصہؓ سے صحف صدیقی بھیجنے کی درخواست کی تو بعض روایات کے مطابق ام المومنین نے خلیفہ سوم کو اس شرط پر ارسال کیے کہ مصاحف عثمانی کی تدوین کے بعد صحف صدیقی ان کو واپس کردیے جائیں گے (فارسل عثمان الی حفصة فطلبها فأبت حتی عاهدها

لیرد ھا الیھا ، فنسخ منھا ثم ردھا ، فلم تزل عندھا ...... فتح الباری ۹/ ۲۶)، حضرت حفصہؓ کو صحف صدیقی اپنی تحویل میں رکھنے پر اصرار کیوں تھا جب کہ وہ ان کی ذاتی میراثِ پدری نہ تھے بلکہ سرکاری دستاویزات تھے۔ (کتاب المصاحف ۹-۱۰، ۲۴-۲۵)

دیگر مصاحفِ صحابہ کا انجام

حضرت مروان بن حکم امویؒ کے کارنامے اور صحف صدیقی کے معاملے میں ان کے طریقے کو سمجھنے کے لیے عہد عثمانی میں دیگر مصاحف صحابہ کرام کے انجام کو سمجھنا ضروری ہے کیوں کہ وہ ایک خاص تاریخی اور دینی تناظر کے سلسلہ سے وابستہ ہیں، حضرت مروانؒ بلکہ ہماری تاریخی بے شعوری کا المیہ یہ ہے کہ حضرت موصوف کی ذات والا صفات اور ان کے کارناموں کو قطعی سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ ان کو بے عقلی و بے دینی سے متہم و مطعون کیا گیا، صحف صدیقی کے لیے مصاحف صحابہ کا معاملہ تاریخی تناظر فراہم کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سبائی فتنہ نے خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے پاک دامن پر بھی فتنہ انگیزی کے چھینٹے اڑائے ہیں اور وہ اہل سنت کے ایک خاص طبقے میں بھی اپنے بعض کاموں کے لیے مطعون بنائے گئے ہیں اور یہ ایک تاریخی سازش کی کڑیاں ہیں جو خلافت اسلامی کے اہم ترین مثالی دور کو بھی ناقابل اعتبار بنانا چاہتی ہیں تاکہ اسلامی حکومت کو دنیاوی ثابت کیا جاسکے، حضرت عثمانؓ کے اس کارِ عظیم پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا تھا اور مستشرقین اور اسلام دشمن عناصر آج تک اپنے اعتراضات والزامات سے فارغ نہیں ہوسکے، مصاحف دیگر کے بارے میں حضرت عثمانؓ کی کمت مومنانہ تھی اور حقیقی بھی۔ (ملاحظہ ہو: ڈاکٹر اسماعیل احمد الطحان کا مضمون، اردو ترجمہ از محمد رضی الاسلام، بہ عنوان " تاریخ تدوین وجمع قرآن "، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، ۲۲، ۳، ۸۵)

امام بخاریؒ کی روایت حدیث: ۴۹۸۷ میں آخری جملہ ان دوسرے مصاحف قرآنی سے متعلق موجود ہے:" وامر بما سواہ من القرآن فی کل صحیفۃ او مصحف ان یحرق "، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، فتح الباری ۹/ ۱۰، ابن ابی داؤد، کتاب المصاحف ۱۲ میں جلانے کا ذکر ہے: ...... حین حرق عثمان المصاحف ......) حضرت عثمانؓ نے مصحف عثمانی کے سوا تمام صحیفوں یا مصاحف کو جن میں قرآن موجود تھا، جلا دینے

کا حکم دیا اور وہ جلا دیے گئے، حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تشریح میں دوسرے مصاحف کے جلا دینے کے معاملہ سے بحث کی ہے، اکثر روایتوں میں یہی آتا ہے کہ ان کو جلا دینے کا حکم دیا گیا اور وہ جلا دیے گئے، بعض روایات میں مذکور ہے کہ ان کو مٹا ڈالا گیا یا دھو ڈالا گیا یا پھاڑ ڈالا گیا یا محو کر ڈالا گیا، حافظ ابن حجرؒ نے ان مختلف روایات میں حسب عادت تطبیق دی ہے کہ پہلے مٹایا گیا پھر دھویا گیا پھر پھاڑا گیا اور پھر جلایا گیا، غرض کہ ان دیگر مصاحف کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا گیا۔

نذرِ آتش کرنے (احراق) کی روایات کثیر بھی ہیں اور زیادہ معتبر بھی - اور بعض اہم بزرگوں سے مروی بھی، حضرت علی بن ابی طالب ہاشمیؓ سے حضرت سوید بن غفلہ صحابی کی روایت میں بہت اہم تبصرہ اور حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے، حضرت موصوف فرماتے تھے کہ مصاحف دیگر کو جلا دینے کے معاملے میں حضرت عثمانؓ کی بابت خیر کے سوا کچھ نہ کہو: " لا تقولوا لعثمان فی احراق المصاحف الا خیرا "- مصعب بن سعد کی روایت میں آتا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے دوسرے مصاحف جلا دیے تو میں نے لوگوں کو پایا، ان کو یہ بات پسند آئی یا عجیب لگی لیکن ان میں سے کسی نے بھی نکیر نہ کی " ادرکت الناس متوافرین حین حرق عثمان المصاحف، فاعجبھم ذلک - او قال - لم ینکر ذلک منھم احدٌ "۔ (کتاب المصاحف ۱۲ میں حضرت علیؓ کی روایت وتبصرہ کے علاوہ آخری روایت بھی تقریباً انہیں الفاظ میں موجود ہے)

حضرت عثمانؓ کا یہ طریقہ سنت بن گیا کہ بہت سے ائمہ کرام جیسے حضرت عروہ بن زبیر اور حضرت طاؤس وغیرہ ایسے تمام خطوط (الرسائل) اور کاغذات کو جلا دیتے تھے جن میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھی ہوتی تھی، کیوں کہ ان کو ذخیرہ کرنے میں قباحت تھی اور بسملہ اور نام الٰہی کی توہین کا خدشہ تھا، آج بھی یہی طریقہ رائج ہے اگرچہ بعض علما کو پسند نہیں۔ (فتح الباری ۹/ ۲۷)

دوسرے صحابہ کرام اور تابعین کے مصاحف کو جلا دینے کے پیچھے یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ ان میں قرأت کے بہت سے اختلافات پائے جاتے تھے، ان اختلافات کے نتیجے میں گروہ بندیاں ہونے لگی تھیں اور بات تکفیر تک جا پہنچی تھی، اس سے زیادہ اہم حکمت یہ تھی کہ قرآن مجید

میں اختلاف ہونے لگا تھا اور بعض صحابہ کرام کو فکر ہو چلی تھی کہ مسلمان بھی یہود و نصاریٰ کی مانند کتاب الٰہی کو لفظی و معنوی تحریفات تک پہنچا دیں گے، حضرت عثمانؓ نے اسی مقصد عظیم کی خاطر کہ کتاب الٰہی میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ رہ جائے، ایک طرف تو سات مصاحف عثمانی تیار کرا کے تمام بلاد اسلامی میں پھیلا دیے اور ان کو معیاری مصحف قرار دے کر صرف ان ہی کی نقول کی اجازت دی اور دوسری طرف ایسے تمام نسخوں اور صحیفوں کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا جو معیاری قرآن مجید کے نسخہ سے مختلف تھے تاکہ امت اسلامی کتاب اللہ پر متحد و متفق رہے، اختلاف سے بچے اور ایک قرآن کی پابند رہے، یہ کارنامہ عظیم تھا جس نے وحدت کتاب الٰہی کے ذریعہ وحدتِ امت اور اتحاد اسلامی کی راہ ہموار کی، آج اسی کے سبب ایک شوشہ کا بھی فرق نہیں پایا جاتا۔

حضرت مروان امویؓ کا کارنامہ شرط کے مطابق اور حضرت ام المومنین حفصہؓ کی خاطر عاطر کی پاس داری میں حضرت عثمانؓ نے مصاحف عثمانی کی تدوین و ترتیب کے بعد ''صحف صدیقی'' ام المومنین کی خدمت گرامی میں واپس بھیج دیے کہ یہی شرط وفاداری و استواری بھی تھی، مصاحفِ عثمانی کی تدوین و ترتیب حضرت عثمانؓ کی خلافت راشدہ کے اولین دو تین برسوں کے اندر اندر ہی ہوگئی تھی، لہذا یہ صحف صدیقی حضرت حفصہؓ کے پاس پورے دس سال تک خلافت عثمانی میں رہے اور لگ بھگ پانچ سال تک خلافت مرتضوی میں ان ہی کی تحویل میں رہے اور حضرت معاویہؓ کے اولین برسوں میں بھی وہ ان ہی کے پاس موجود و محفوظ اور مامون تھے۔

حضرت مروان بن حکم امویؓ امیر المومنین حضرت معاویہ بن ابی سفیان امویؓ کے عہد خلافت میں مدینہ منورہ کے گورنر (والی) بنے، ان کا تقرر بہ طور امیر مدینہ ۴۲ھ/۶۶۳ء میں ہوا تھا اور یہ پہلا تقرر تھا، وہ بعد میں بھی گورنر رہے، بلاذری کے مطابق اپنی پہلی گورنری کے زمانے میں حضرت مروان نے صحف صدیقی ان سے طلب کیے تھے ...... وصلی علیها مروان بن الحکم فی امرته الاولی علی المدینة (۱/۴۲۷)، اپنی امارت مدینہ کے دوران حضرت مروان بن حکمؓ نے حضرت حفصہؓ سے صحف صدیقی بھیجنے کی درخواست کی (بلاذری، انساب الاشراف، ۱/۴۲۷، امارت مروان کے لیے: ابن کثیر، البدایه والنهایه، مطبعة السعادة مصر، ۱۹۳۲، ۸/۲۴۴ و مابعد) جن سے قرآن لکھا گیا تھا مگر ام المومنین نے انہیں حوالے کرنے سے

انکار کر دیا، روایت کے دروبست سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مروان برابر ان سے صحف صدیقی کی حوالگی کا مطالبہ کرتے رہتے تھے اور حضرت حفصہؓ برابر انکار فرماتی تھیں، یہ روایت ابوعبید اور ابن ابی داؤد کی ہے جو شعیب نے حضرت امام زہری سے نقل کی ہے اور امام موصوف سے حضرت سالم بن عبداللہ بن عمرؓ نے روایت کی تھی، حضرت سالم حضرت حفصہؓ کے بھتیجے تھے، روایت کا متن ابن حجر نے نقل کیا ہے: '' کان مروان یرسل الی حفصة – یعنی حین کان امیر المدینة من جهة معاویة – یسألها الصحف التی کتب فیها القرآن فتابی ان تعطیه ......'' (ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، ۹/۲۶، ابن ابی داؤد، کتاب المصاحف، ۹-۱۰ میں وفات کا حوالہ نہیں)، روایت میں مزید صراحت ہے کہ حضرت حفصہؓ نے اپنی وفات تک ''صحف صدیقی'' اپنی تحویل میں رکھے اور حوالے کرنے سے انکار کیا، حضرت حفصہؓ کی وفات شعبان ۴۵ھ/۶۶۵ء میں صحیح روایت کے مطابق ہوئی، حضرت مروانؓ نے بہ طور امیر مدینہ ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور ان کے جنازے کی مشایعت کی اور جنت البقیع میں ان کی تدفین میں حصہ لیا۔ (ابن سعد، طبقات، ۸/۶۰، اصابه، ۴/۲۶۵، بلاذری، انساب الاشراف، اول ۴۲۷ مقالہ حفصہ، اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور)

روایت مذکورہ بالا کا دوسرا حصہ شعبان ۴۵ھ/نومبر ۶۶۵ کے بعد شروع ہوتا ہے، اس کے مطابق حضرت حفصہؓ کی تدفین کے معاً بعد حضرت مروان امویؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بڑی تاکید اور عزیمت کے ساتھ مطالبہ کیا کہ وہ ان صحف صدیقی کو حضرت مروان بن حکمؓ کے حوالے ضرور بالضرور اور فوراً کر دیں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان صحف صدیقی کو فوراً امیر مدینہ حضرت مروان بن حکمؓ اموی کے پاس بھیج دیا'' قال سالم: فلما توفیت حفصة و رجعنا من دفنها ارسل مروان بالعزیمة الی عبد الله بن عمر لیرسلن الیه تلک الصحف فارسل بها الیه عبد الله بن عمر ......'' (فتح الباری ۹/۲۶، کتاب المصاحف، ۲۱: فساعة رجعوا من جنازة حفصة ارسل بها عبد الله بن عمر الی مروان ففشاها و حرقها مخافة ان یکون فی شئی من ذلک اختلاف لما نسخ عثمانؓ)۔

صحف صدیقی کے باب میں روایت بالا کا تیسرا حصہ بہت مختصر بھی ہے اور بہت اہم

بھی ہے، جیسے ہی وہ صحف ان کے پاس پہنچے، حضرت مروانؒ نے حکم دیا کہ وہ پھاڑ ڈالے جائیں اور وہ پرزہ پرزہ کردیے گئے، حضرت مروان امویؒ نے اس کے بعد فرمایا کہ میں نے ایسا اس لیے کیا کہ مجھے خدشہ تھا کہ اگر لوگوں پر زیادہ زمانہ گزر گیا تو ان صحف صدیقی کے باب میں کوئی شبہ کرنے والا شک وشبہ کی فضا نہ پیدا کردے''...... فامر بها مروان فشققت و قال: انما فعلت هذا لانی خشیت ان طال بالناس زمان ان یرتاب فی شان هذه الصحف مرتاب'' (فتح الباری ۹/۲۶، کتاب المصاحف ۹-۱۰، نیز ۲۵ کے مطابق حضرت حفصہؓ کے پاس وہ مصاحف تھے تا آنکہ مروان نے ان کو لے کر جلا دیا:''...... فلم تزل عندها حتی ارسل مروان فاخذها فحرقها'' اس میں وفات ام المومنین کا حوالہ نہیں ہے)۔

ابوعبیدہ کی روایت میں ہے کہ وہ صحف پارہ پارہ کردیے گئے (فمزقت)، ابوعبید کا تبصرہ اس روایت پر یہ ہے کہ اس روایت کے سوا یہ نہیں سنا گیا کہ حضرت مروانؒ نے ان صحف (صحیفوں) کو پارہ پارہ کیا تھا، حافظ ابن حجرؒ نے اس بیان وتبصرہ پر اضافہ فرمایا ہے کہ ابن ابی داؤد نے یونس بن یزید کی وساطت سے ابن شہاب سے اسی جیسی روایت نقل کی ہے، انہوں نے روایت مذکورہ کو مختصراً نقل کرکے آخر میں یہ کہا ہے کہ حضرت مروانؒ نے ان کو پھاڑا بھی اور جلایا بھی، حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت میں ہے کہ ان کو پوری طرح سے دھوڈالا اور ابن ابی داؤد کی روایت مالک از امام زہری میں ہے کہ حضرت مروان نے ان صحف کو لے لیا اور جلا ڈالا، حافظ ابن حجر عسقلانی اپنی عادت تطبیق کے مطابق لکھا ہے کہ ان تمام روایات کو جمع کیا جاسکتا ہے کہ حضرت مروان نے ان صحف کے ساتھ تمام کام کیے، پہلے ان کو پھاڑا، پھر دھویا، پھر جلایا یا اسی طرح سے تمام مراحل نیستی سے ان کو گزارا، حضرت مروانؒ کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر طعن وتشنیع کے پیش نظر تمام روایات کا متن ذیل میں پیش ہے:

...... ووقع فی روایة ابی عبیدة "فمزقت" قال ابو عبید: لم یسمع ان مروان مزق الصحف الا فی هذه الروایة، قلت: قد اخرجه ابن ابی داؤد من طریق یونس بن یزید عن ابن شهاب نحوه، وفیه: ...... "لما توفیت حفصة" فذکره و قال فیه: "فشققها و حرقها"، و وقعت هذه الزیادة من روایة

عمارة بن غزیة ایضا باختصار، لکن ادرجها ایضا فی حدیث زید بن ثابت و قال فیه: "فغسلها غسلا" ...... و عند ابن ابی داؤد من روایة مالک عن ابن شهاب عن سالم او خارجة ...... "فلم تزل عندها حتی ارسل مروان فاخذها فحرقها"، ویجمع بانه صنع بالصحف جمیع ذلک من تشقیق ثم غسل ثم تحریق، ویحتمل ان یکون بالخاء المعجمة فیکون مزقها ثم غسلها والله اعلم "۔ (فتح الباری ۹/۲۶-۲۷، بلاذری، انساب الاشراف، قاہرہ ۱۹۵۹ء، ۱/۴۲۷ میں ہے: ...... وتبعها مروان الی البقیع، و جلس حتی فرغ من دفنها، ثم ارسل الی ابن عمر بعزیمة فی الصحف التی کانت عندها، فیها القرآن علی مانسخ فی ایام ابی بکر، فاخذها و محاها ......)

یہ وضاحت آچکی ہے اور پھر پیش کی جارہی ہے کہ صحابہ کرام وغیرہ کے دوسرے غیر سرکاری مصاحف کے ساتھ حضرت عثمان بن عفان امویؓ نے یہی عمل فرمایا تھا، روایات کے اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مصاحف دیگر کو دھوڈالا تھا، پارہ پارہ کرڈالا تھا اور جلا ڈالا تھا، گویا کہ ان کو نابود کرنے کی ہر ممکن سعی کی تھی، ان کے کاتب وقت، جانشین اور پیروکار حضرت مروان امویؒ نے بھی ان کی حکمت عملی کی پوری پوری پیروی کی تھی، تاکہ ان میں سے کسی شے کے کسی شخص کے لیے باقی رہنے کا خطرہ نہ رہے اور وہ پوری طرح سے معدوم وفنا ہوجائیں، حافظ ابن حجر نے بھی یہی صراحت کی ہے کہ حضرت عثمان کے زمانے میں سوائے صحف صدیقی کے تمام مصاحف مٹا ڈالے گئے، حضرت مروان نے ان کو بھی حضرت حفصہ کے بعد پوری طرح فنا کردیا، تاکہ خطرات وخدشات کا امکان بھی باقی نہ رہے:'' ...... ولهذا استدرک مروان الامر بعدها و اعدمها ایضا خشیة ان یقع لاحد منها توهم ان فیها ما یخالف المصحف الذی استقر علیه الامر ...... "۔ (فتح الباری ۹/۲۷-۲۸)

تجزیاتی اختتامیہ حافظ ابن حجر کے آخری تبصرہ میں حضرت مروان بن حکم امویؒ کے کارنامے کی حکمت وعلت پوشیدہ ہے، تمام مصاحف قرآنی کے فنا ہونے کے بعد صرف مصحف عثمانی کی صورت میں قرآن مجید کا مستند ومعیاری متن مقدس محفوظ ہوگیا تھا اور اس پر صحابہ کرام کا اجماع و

اجماع اور اتفاق تھا، حتی کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے صحابہ کرام کو بھی جن کو اپنے ذاتی مصاحف کی تلفی کا شدید غم اور حضرت عثمانؓ سے بہت شکوہ تھا، مصحف عثمانی کی صورت میں اتحاد امت اور وحدت قرآن کی حکمت سمجھ میں آگئی تو ان کا شکوہ جاتا رہا اور وہ بھی متفق ہوگئے، (ابن ابی داؤد، کتاب المصاحف، ۱۳-۱۴ بالخصوص ۱۷-۱۸) آخر میں ایک مختصر فصل باندھی ہے: رضاء عبد اللّٰہ بن مسعود لجمع عثمانؓ المصاحف؛ اس مختصر فصل میں بنیادی بات یہی کہی گئی ہے کہ قرآن مجید تمہارے نبی ﷺ پر سات ابواب سے سات حروف پر نازل ہوا، وقال: ان القرآن انزل علی نبیکم من سبعة ابواب علی سبعة احرف ...... حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ تائیدی شہادت ہے۔

معیاری اور مستند اور متفقہ مصحف قرآن کے رواج و نفاذ کے بعد صرف صحف صدیقی ایسے قرآنی صحیفے باقی بچے تھے جو مصحف عثمانی کے سوا تھے، اگرچہ ان میں اصل قرآن کے خلاف کوئی چیز موجود نہ تھی کہ مصحف عثمانی ان ہی پر مبنی کر کے لکھے اور مدون کیے گئے تھے، تاہم اس کا بہر حال امکان تھا کہ ان میں بعض کلمات و عبارات کی لکھاوٹ، رسم خط یا املا میں اختلاف ہو اور وہ مستند و معیاری قرآن کے خلاف بہ طور سند پیش کیا جائے، اس سے زیادہ یہ خدشہ اور وہم تھا کہ بعض لوگ مہم چلائیں کہ صحف صدیقی میں مستند مصحف عثمانی کے خلاف کچھ موجود ہے۔

حضرت مروان بن حکم اموی کا "صحف صدیقی" کو نیست و نابود کرنا بعض جدید ذہنوں کو شاق گزرا ہے یا گزر سکتا ہے، جس طرح مستشرقین اور جدید اہل قلم نے صحابہ کرام کے مصاحفِ قرآنی کی بربادی پر ماتم کیا ہے اور اس کے ذریعہ حضرت عثمانؓ کے خلاف مہم چلائی ہے اور کوشش کی ہے کہ صحابہ کرام کا مصحف عثمانی پر اتفاق نہیں ہوا تھا اور وہ ایک غلط کام تھا، اس طرح انہوں نے اتحاد امت، اجماع صحابہ اور وحدتِ قرآن کو پارہ پارہ کرنے کی سعی ناکام کی ہے، حضرت عثمانؓ کا کارنامہ قرآن مجید کی حفاظت کے وعدۂ الٰہی کی انسانی صورت تھی اور حضرت مروانؒ کا کارنامہ اس وعدۂ الٰہی کی تکمیل تھی، انہیں دونوں صحابہ کے اقدام و ہمت اور دینی بصیرت کے سبب ہمارا قرآن ایک ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت
خطوط شبلی کی روشنی میں

از:- پروفیسر ریاض الرحمان شروانی☆

میرے علم کی حد تک علامہ شبلی کے خطوط کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں، ایک مکاتیب شبلی (دو جلدوں میں) اور ایک خطوط شبلی جو جنجیرہ (زنجیرہ) کی فیضی بہنوں (عطیہ بیگم اور زہرا بیگم) کے نام ہیں اور جن کے مرتب منشی محمد امین زبیری ہیں، شاید ایک اور مجموعہ ڈاکٹر سید حسین نے بھی شائع کرایا ہے اور اس کا نام بھی خطوط شبلی ہی ہے لیکن یہ میری نظر سے گزرا ہے، یہاں ہمیں ان خطوط پر گفتگو کرنا مقصود ہے جو فیضی بہنوں کے نام لکھے گئے ہیں، (اس مجموعے پر مقدمہ مولوی عبدالحق کا ہے، میرے سامنے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے جسے تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور نے اپنے روایتی خوب صورت معیار طباعت کے مطابق شائع کیا ہے، اس پر سال اشاعت درج نہیں ہے لیکن میں نے یہ ۱۹۴۸ء میں لاہور میں ایک روپیہ آٹھ آنے میں خریدا تھا، یہ کتاب چھوٹے سائز کے ۱۲۸ صفحات پر چھپی ہے، فہرست مضامین، دیباچہ (از مرتب) اور مقدمہ وغیرہ ۲۶ صفحات پر محیط ہیں) عطیہ بیگم کے نام خطوط کی تعداد ۵۵ ہے اور یہ ۷۷ صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں، ان میں علامہ شبلی کے ایک خط کا عکس بھی شامل ہے، زہرا بیگم کے نام خطوط کی تعداد ۲۷ ہے اور یہ ۲۸ صفحوں کا احاطہ کرتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب خط عموماً مختصر ہیں اور زہرا بیگم کے نام خطوط کچھ زیادہ ہی مختصر ہیں لیکن ان مختصر خطوط میں تعلق خاطر، خواہش، اصلاح، موسیقی سے شغف، سیاست، علم و دانش، ایک طرف ندوۃ العلما سے گہرا لگاؤ اور دوسری طرف اردو سے شدید دل چسپی اور فارسی شعر و ادب کا اعلا ذوق، سب ہی کچھ موجود ہے، ان

☆حبیب منزل میرس روڈ، علی گڑھ۔

خطوط کے مطالعے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان کی مقصود خاطر دراصل عطیہ بیگم ہی تھیں کیوں کہ زہرا بیگم کے نام کے بیشتر خطوط بھی ان کے ذکر سے مملو ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان خطوط میں بھی اصلی تخاطب عطیہ ہی سے ہے، زہرا بیگم کا صرف پردہ ہے۔

علامہ شبلی نے اپنے خطوط میں عطیہ کو خاتون محترم، عزیزی، قرۃ عینی اور مہد علیا جیسے القاب سے مخاطب کیا ہے لیکن قرۃ عینی اور مہد علیا صرف ایک ایک خط کا طرز تخاطب ہے ورنہ زیادہ تر عزیزی یا خاتون محترم لکھا ہے، عزیزی خاتون محترم سے بھی زیادہ، کئی خطوط بغیر القاب کے بھی لکھے ہیں، زہرا بیگم کے لیے طرز تخاطب بالعموم خاتون محترم ہے یا پھر خاتون محترم و مکرم، مکرمۂ من، مکرمی، مکرمۂ ما اور محترم من، (کئی ان کے نام کے خط بھی القاب سے بے نیاز ہیں) ان دونوں بہنوں کے نام علامہ شبلی کے طرز تخاطب سے بھی ان کے ساتھ علامہ کے تعلقات کی نوعیت کا فرق واضح ہو جاتا ہے، اگر ہم نہ صرف عطیہ فیضی کے نام بلکہ زہرا بیگم کے نام کے ان خطوط کا بھی بہ نظر غائر اور بغیر کسی ذہنی تحفظ و تعصب کے مطالعہ کریں جن میں عطیہ کا ذکر آیا ہے تو عطیہ فیضی کے ساتھ علامہ شبلی کے تعلق خاطر کی نوعیت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے، عطیہ فیضی کے نام خطوط ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۱ء کے درمیان لکھے گئے ہیں اور زہرا فیضی کے نام صرف ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں، گویا یہ بالعموم بیسویں صدی کے پہلے عشرے کے خطوط ہیں جنہیں لکھے ہوئے اب سو برس ہو رہے ہیں، آپ سو برس پہلے کے ہند اسلامی معاشرے کا تصور کیجیے، اس معاشرے میں بالخصوص خواتین کی جو تعلیمی اور ذہنی کیفیت اور معیار تھا، اسے پیش نظر رکھیے، خود علامہ کے مزاج، ان کے رجحانات اور ان کی ترجیحات کو بھی فراموش نہ کیجیے اور پھر سوچیے کہ اچانک اس معاشرے کے افق پر ایک ایسی نوجوان خاتون طلوع ہوتی ہیں جو غیر معمولی ذہانت، ذوق سلیم اور شائستہ مزاجی سے متصف ہیں اور اس کے ساتھ مصنف، مقرر اور ماہر فنون لطیفہ بننے کے امکانات اپنے اندر رکھتی ہیں، علامہ کو ان میں ہندوستان کی مسلم خواتین کا مستقبل نظر آتا ہے، انہیں ان ہی اسباب سے ان میں دل چسپی پیدا ہوتی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ عطیہ میں جو رجحانات پائے جاتے ہیں، وہ ان میں درجہ کمال حاصل کریں اور اس کے لیے اپنی خدمات بھی پیش کرتے ہیں، عطیہ کی صلاحیتوں کے اعتراف اور ان کے ساتھ تعلق خاطر میں علامہ شبلی

تنہا نہیں ہیں بلکہ بیسویں صدی کے ہندوستان کی ایک دوسرے معروف روزگار علامہ، اقبال بھی اس معاملے میں ان کے شریک و سہیم ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ شبلی کو عطیہ نے اپنی ذہانت و لیاقت سے ہندوستان میں متاثر کیا اور اقبال کو یورپ میں لیکن علامہ شبلی کے پاؤں میں ندوۃ العلما کی مضبوط زنجیر پڑی ہوئی ہے، وہ اس زنجیر کو اپنی شخصیت کا زیور تسلیم کرتے ہیں اور کسی کی بھی خاطر اسے پانوں سے اتارنا نہیں چاہتے، ندوۃ العلما کو ان کی زندگی کے مقاصد میں اولیت حاصل ہے اور اس حقیقت کا ان خطوط کے ذریعہ بھی بار بار ادراک ہوتا ہے، مثلاً ایک خط میں تحریر فرمایا: ''......افسوس دیر تک ملنے کی امید نہیں، میں (تمہاری خاطر) وطن، احباب، آرام سب چھوڑ سکتا ہوں لیکن ایک مذہبی اور قومی کام کیوں کر چھوڑ دوں ورنہ بمبئی یا جزیرہ دو قدم پر تھے''، ندوۃ العلما کی خدمت کو علامہ فرض مذہبی ہی سمجھ کر انجام دیتے تھے، زہرا فیضی کے نام ایک خط میں بات شاعری کی ہو رہی ہے لیکن لکھتے ہیں: ''ندوہ کا جھنجٹ اور شاعری ساتھ ساتھ چلنے کی چیزیں نہیں، ندوہ فرض مذہبی ہے اور شاعری فرض طبعی''، کیا علامہ کا فیضی بہنوں کے ساتھ تعلق خاطر بھی شاعری کے زمرے میں نہیں آتا ہے؟

علامہ کے خطوط حسن انشا کا بھی شاہکار ہیں اور ہماری رائے میں اردو کے بہترین خطوط کی اگر کوئی مختصر سے مختصر فہرست تیار کی جائے تو اس میں ان خطوط کو ضرور شامل کرنا ہوگا، ان میں اپنائیت بھی ہے، سادگی بھی ہے، جذبات کا بے دریغ اظہار بھی ہے اور مراسلے کو مکالمہ بنا دینے کی صلاحیت بھی، یہ خصوصیات ان خطوط میں جابجا بکھری ہوئی ہیں اور ان کا مجموعی تاثر اعلا درجے کی خطوط نویسی کا ہوتا ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، ان خطوط میں حاوی جذبہ عطیہ فیضی کی ذہنی تربیت اور ان کی علمی استعداد میں اضافے کا ہے، پہلے ہی خط میں ''جنجیرہ کے سفر کا...... موقع'' ہاتھ سے جاتے رہنے پر اظہار تاسف کے ساتھ ''دیوان اور سوانح مولانا روم'' کی ترسیل کا مژدہ سنایا ہے، یہ اگرچہ نواب بیگم صاحبہ جنجیرہ نازلی بیگم (عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کی بڑی بہن) کے لیے ہیں لیکن عطیہ کے ذریعہ بھیجنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ ان کی نظر سے بھی گزر جائیں، ساتھ ہی ندوۃ العلما کو کہیں فراموش نہیں کرتے ہیں، اسی خط میں لکھتے ہیں: ''ندوہ کا مقصد اسلام کی حمایت اور علوم دینی کا بقا ہے لیکن نہ اس طرح کہ جو پرانے خیال کے مولوی چاہتے ہیں، پس

گویا ندوہ مذہبی تعلیم کی اصلاحی صورت ہے''، اس ''اصلاحی صورت'' کی تشریح بعض دوسرے خطوط میں آئی ہے لیکن اس عبارت سے بھی علامہ شبلی کی اصلاح پسندی کا نقش تو اجاگر ہو ہی جاتا ہے، اسی خط میں عطیہ کی زبان، بالخصوص بمبئی کے مخصوص محاوروں کی غلطیوں کی نشان دہی اور اصلاح بھی کی ہے، (دونوں بہنوں عطیہ اور زہرا کی اصلاح زبان کی کوشش اور بھی متعدد خطوط میں پائی جاتی ہے) انہوں نے انہیں (بالخصوص عطیہ کو) بعض فارسی اشعار کا مطلب بھی دل لگا کر سمجھایا ہے، اس خط کے اخیر میں وہ بات لکھی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یعنی عطیہ کو ہر میدان میں صف اول میں دیکھنے کی خواہش، ''میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لکچرار بن جائیں جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں اردو میں تا کہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں، آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے، صرف مشق کی ضرورت ہے'' آپ یہاں ملاحظہ فرمائیے کہ علامہ کس طرح دو متضاد جذبوں میں بٹے ہوئے ہیں، کہتے ہیں: ''ہم پرانے زمانے کے لوگ آزادی سے بے پردہ مجامع عام میں عورتوں کا تقریر کرنا پسند نہیں کرتے لیکن آپ تو اس میدان میں آ چکیں، اس لیے جو کچھ بھی ہو کمال کے درجے پر ہو''، گویا یہاں علامہ شبلی کی وہ کیفیت ہے جس کا اظہار مرزا غالب نے اس طرح کیا ہے:

ایمان مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر   کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

ان خطوط سے علامہ شبلی کی فطرت کے بعض اور تضادات کا بھی علم ہوتا ہے، مثلاً ایک طرف ان کی رائے ہے کہ عورتوں کا ''جمال اور حسن نزاکت پر موقوف نہیں، تنومندی، دلیری، دیو پیکری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے، مرد نما عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہے'' اور دوسری طرف جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ عطیہ فیضی اپنے قائم کردہ ''مدرسۃ البنات'' میں ڈرل کراتی ہیں تو وہ زہرا فیضی کو لکھتے ہیں: ''عطیہ سے کہیے کہ ڈرل کی ضرورت نہیں، کچھ تو مردوں کے لیے رہنے دیں، یہ مردوں کی وحشیانہ خصوصیت ہے، اس میں مساوات کی کیوں خواہش ہے''؟

وہ اس کے بھی مخالف تھے کہ عورتوں کے لیے مردوں سے جداگانہ نصاب تعلیم ہو، زیادہ سے زیادہ یہ مراعات دینے پر آمادہ تھے کہ ''رضاعت، پرورش اولاد وغیرہ مضامین عورتوں کے

نصاب میں اضافہ ہونے چاہئیں''، تعجب ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں یہ ایک روایتی عالم دین کے خیالات ہیں، اس خط میں شوق ملاقات کا بھی اظہار ہے اور یہ خواہش بھی کہ عطیہ لکھنؤ کے کسی خاص تحفے کی فرمائش کریں اور علامہ اس کی تکمیل فرمائیں، ایک اور خط میں انہیں موازنہ انیس و دبیر اور شعر العجم کے مطالعے کا شوق دلایا ہے اور ان دونوں بہنوں کی فارسی کی استعداد بڑھانے کے لیے اپنے مجموعہ کلام بوئے گل کا درس دینے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے، اس خواہش کا اظہار اور کئی خطوط میں بھی ہوا ہے، البتہ دوسرا مجموعہ کلام دستہ گل پڑھانے کے لیے تیار نہیں ہیں کیوں کہ اس میں ''زیادہ شوخ، آزاد اور غیر معتدل اشعار'' قلم سے نکل گئے ہیں، یہ بھی علامہ شبلی کے ضبط و احتیاط کی دلیل ہے کہ وہ ان خواتین کو بس بوئے گل سے واقف رکھنا چاہتے ہیں، دستہ گل سے شناسا نہیں کرنا چاہتے، وہ عطیہ فیضی کی علالت کی خبر سے بے چین ہو جاتے ہیں، براہ راست بھی خیریت دریافت کرتے ہیں اور زہرا فیضی کے ذریعہ بھی۔ دیکھیے، زہرا فیضی کے نام خط سے کیسی بے چینی ظاہر ہوتی ہے خیریت معلوم کرنے کے لیے، زہرا بیگم کو تار دیا تھا جس کا جواب انہوں نے خط کے ذریعہ دیا، لکھتے ہیں: ''آپ نے غضب کیا کہ تار کا جواب خط سے دیا، اتنی دیر تک طبیعت کو سخت تردد رہا''، علامہ بہت حساس شخص تھے، عقلیت کی فراوانی کے ساتھ ان میں جذباتیت کی بھی کمی نہیں تھی، کہتے ہیں کہ ''کسی عزیز اور دوست کی رخصت کے وقت کا میں تحمل نہیں کر سکتا''، یہ وہ موقع ہے جب عطیہ فیضی انگلستان جا رہی ہیں، علامہ کا دل چاہتا ہے کہ انہیں بمبئی جا کر خدا حافظ کہیں لیکن نہیں جاتے کہ ''رخصت کے وقت کا تحمل'' نہیں کر سکتے تھے، اس جذبے میں علامہ شبلی تنہا نہیں تھے، ہم میں سے بہت سوں کو اپنی زندگی میں اس قسم کے تجربات ہوئے ہوں گے، البتہ علامہ نے اس وقت انہیں ایک فارسی نظم ''خدا حافظ'' کہہ کر ضرور بھیج دی تھی، اس نظم کا ایک شعر ایسا ہے جو شبلی ہی کہہ سکتے تھے

بروی سوئے پیرس و لندن   و ز رہ کعبہ و حجاز آئی

ساتھ ہی زہرا فیضی کے نام ایک خط میں یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ نظم کی یہی دعا ایسی ہے جو شاید قبول نہ ہو اور جب عطیہ فیضی بیرونی سفر سے واپس آ جاتی ہیں تو انہیں کس مسرت سے لکھتے ہیں: ''ایک بے ریا دل، ایک مخلص دل، وفا شعار، دل کی طرف سے سفر سے مراجعت کی مبارک باد

قبول کرو، میری زندگی کا سخت افسوس ناک واقعہ ہے کہ یہ مبارک باد میرے لب کے بجائے زبانِ قلم ادا کرتی ہے''۔

علامہ کو عطیہ فیضی کی مزاج داری کا بھی بہت لحاظ رہتا ہے، اسی خط میں مزید تحریر کیا ہے:

''تہنیت کی غزل الگ مرسل ہے جس کے ساتھ ایک نہایت حقیر ہدیہ ہے، کیا تم ان دونوں چیزوں کو قبول کر سکتی ہو؟ شہنشاہ ایڈورڈ اور پریزیڈنٹ فرانس کا معزز مہمان اس قدر اپنے رتبے سے نہیں اتر سکتا، ہاں یاد رکھو آفتاب ذرے پر بھی چمکتا ہے''، ایک مرتبہ عطیہ نے علامہ کو کچھ مدت خط نہیں لکھا ہے تو علامہ نے بجائے ان کے زہرا صاحبہ کو لکھا: ''میرے خط کا جواب عزیز موصوف (عطیہ) نے نہیں لکھا، شاید کسی بات سے ناراض ہوگئی ہوں یا جلد جلد خط و کتابت کرنا خلاف شان سمجھا ہو، بہر حال میں بھی اب پیش دستی نہیں کرتا''، اس کا مطلب ہے کہ ساری مزاج داری اور دل دہی کے باوجود علامہ اپنی انانیت اور خودداری کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ایک خط میں خود ان ہی کو مخاطب کیا ہے: ''آپ کا غضب آلود خط ملا، افسوس ہے کہ آپ نے اس کو اور نگاہ سے دیکھا، علی گڑھ کی تحقیر ہرگز منظور نہ تھی بلکہ غرض یہ تھی کہ علی گڑھ کے تمام رؤسا باہر (مراد غالباً مضافات سے ہے) کے رہنے والے ہیں اور ان کی بیویاں باہر (مضافات میں) رہتی ہیں، اس لیے یہ علی گڑھ نہ آسکیں گی۔ آپ کا اس قدر برہم ہونا میرے لیے موجب افسوس و رنج ہے...... امید ہے آپ خط دیکھنے کے بعد غیظ و غضب کو دور فرمائیے گا اور قدیم مراسم قائم رہیں گے''، چوں کہ ہمارے سامنے عطیہ فیضی کے خطوط نہیں ہیں، اس لیے علی گڑھ کا معاملہ واضح نہیں ہوتا ہے، البتہ ان کی دل دہی کے باوجود اس خط کے بین السطور سے بھی علامہ کی انانیت صاف جھلک رہی ہے، ان کی خودداری کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ جب وہ دونوں بہنوں میں سے کسی کو کوئی کتاب بھیجتے اور وہ قیمت دینا چاہتیں تو علامہ خفا ہو جاتے اور کہتے کہ ''میں تو سوداگر اور تاجر نہیں ہوں''، ایک موقع پر عطیہ نے انہیں لکھ دیا کہ آپ بدہمت ہیں، علامہ کے لیے یہ وار بہت کاری تھا اور اس کی انہوں نے جو توجیہ کی ہے وہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر ایسے قومی کام کرنے والے کی مجبوری رہی ہے جس کا تعلق خاص کر مسلمانوں سے ہو، اس سلسلے میں نام متعدد اکابر کے لیے جا سکتے ہیں لیکن بات طویل ہو جائے گی، بہر حال علامہ نے لکھا: ''اگر پبلک

کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمت کا اندازہ کر سکتیں...... میں اگر عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً تباہ ہو جائے''، علامہ شبلی کو اس کا بہت ارمان تھا کہ یہ دونوں بہنیں بالخصوص عطیہ فیضی لکھنؤ آئیں، زہرا بیگم آئیں بھی لیکن عطیہ نہیں آسکیں، وہ نازلی بیگم سے ندوۃ العلما کی کسی عمارت کا سنگ بنیاد رکھوانے کے خواہش مند تھے لیکن ماحول اس کے لیے ساز گار نہیں تھا، (معلوم نہیں اب بھی ہے یا نہیں کہ کوئی خاتون کسی دینی مدرسے کا سنگ بنیاد رکھیں)، ایک مرتبہ عطیہ بیگم کے آنے کا امکان پیدا ہوا تھا تو مشیر الحسن قدوائی صاحب کی خواہش تھی کہ وہ ان کے ساتھ قیام کریں (عطیہ کی جاذبیت کا ایک اور ثبوت!)، اس سلسلے میں علامہ نے انہیں لکھا: ''اگر آپ لکھنؤ آکر کسی اور کی مہمان ہوئیں تو میں اس زمانے میں لکھنؤ چھوڑ کر چلا جاؤں گا''، یہ شکوے کا کتنا مہذب انداز ہے لیکن ساتھ ہی اس میں کتنی اپنائیت پائی جاتی ہے، انہیں اس کا احساس تھا کہ ان بہنوں کا معیار رہائش کتنا بلند ہے، اس لیے وہ کبھی دریافت کرتے کہ لکھنؤ میں آپ کے قیام کا کیا انتظام کیا جائے اور کبھی پیش کش کرتے کہ وطن سے اپنی بیٹیوں کو بلوالیں گے تا کہ مہمان نوازی کا حق ادا ہو سکے اور انہیں ہر طرح کا آرام ملے۔

ایک مرتبہ علامہ نے زہرا فیضی کو خط میں صرف سلام علیکم لکھ کر بھیج دیا، جواب میں انہوں نے مختصر نویسی کی شکایت کی تو اس کے جواب الجواب میں علامہ نے جو نکتہ آفرینی فرمائی اور جیسا بلیغ خط لکھا وہ داد سے مستغنی ہے، لکھا: ''آپ نے مختصر نویسی کی شکایت کی ہے لیکن انصاف فرمائیے اگر ایک کاغذ بالکل سادہ ہو اور ایک پر دو ہی حرف ہوں تو آپ کس کو مختصر کہیں گی، میں نے سلام علیکم بھی لکھا لیکن آپ صاحبوں نے تو مطلق یاد ہی نہیں کیا، شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ میں بار خاطر ہونے سے پرہیز کرتا ہوں...... جب میں دیکھتا ہوں کہ آپ صاحبوں کے خطوط کبھی ابتداءً نہیں آتے بلکہ میرے جواب میں آتے ہیں تو سمجھ لیتا ہوں کہ کیوں بار بار زحمت دوں اور زبردستی آپ سے جواب حاصل کروں، عزیزی عطیہ کو سلام کہنا لیکن پھر وہی خیال ہے، ناخواندہ مہمان کیوں بنوں''، اس خط سے بھی علامہ کی خودداری صاف عیاں ہے۔

ندوۃ العلما میں اصلاح نصاب اور آج کی اصطلاح میں جدید کاری، علامہ شبلی کی دل چسپی اور جدوجہد کا خاص میدان تھا، اس سلسلے میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے

محسوس ہوتا ہے کہ وہ بیسویں صدی کے آغاز میں نہیں، اکیسویں صدی میں ان خیالات کا اظہار کررہے ہیں، ایک خط میں عطیہ فیضی کو اطلاع دیتے ہیں: ''ندوہ میں جدید اسٹاف انگریزی اور ادب کا قائم ہوا...... دوگریجویٹ ملازم رکھے گئے اور ایک ادیب عرب، اب علما کا گروہ بھی انگریزی داں بن کر نکلے گا اور یہی میری اصلی آرزو ہے'' آج جو لوگ مدارس دینیہ میں جدید کاری کا مشورہ دیتے ہیں وہ اس سے زیادہ اور کیا کہتے ہیں، موضوع سے تھوڑا ساہٹ کر یہ عرض کرنے کو دل چاہتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی علی گڑھ میں جس ''قدامت'' اور ندوہ میں جس ''جدیدیت'' کی تبلیغ کرتے رہے اگر اس میں انہیں کام یابی ہوجاتی تو فاصلے کتنے مٹ جاتے اور قرب کتنا بڑھ جاتا!

علامہ شبلی کے سیاسی خیالات عام طور سے معلوم ہیں، یہ خطوط بھی اس ذکر سے خالی نہیں ہیں، ایک خط میں اس زمانے کی مسلم لیگ کا مذاق اس طرح اڑاتے ہیں: ''آج کل یہاں (لکھنؤ میں) مسلم لیگ کا اجلاس تھا، تمام ہندوستان کے لال بجھکو جمع تھے، ان کی تجویزوں اور خیالات پر ہنسی آتی ہے'' اور ایک دوسرے خط میں رقم طراز ہیں: ''مسلمان پالیٹکس میں آئے تو جس طرح نادان بچہ بات بات پر مچلتا ہے اور طفلانہ حرکتیں کرتا ہے''، کیا ہم اس سے آج بھی سبق نہیں لے سکتے؟ پھر لکھتے ہیں ''اب کے دلی میں انعام الحق صاحب (یہ صاحب سرکاری ملازم تھے) سے ملاقات ہوئی اور دیر تک صحبت رہی، شکر ہے کہ وہ بالکل ہم خیال ہیں اور ان کا اعتقاد ہے کہ مسلمان جس چیز کو قبلۂ حاجات سمجھ رہے ہیں وہ غلامی اور خوشامد کا ایک کارخانہ ہے''، ایک اور خط میں تحریر ہے ''ہندو جوایتی لغویات (ہستیالوجی) کو زندہ کررہے ہیں تو یہ پولیٹکل تدبیر ہے عام پبلک کی کشش ان ہی چیزوں سے پیدا ہوسکتی ہے (یہ خیالات آج کل کے حالات پر بھی پوری طرح صادق آتے ہیں) مسلمانوں پر افسوس ہے کہ نہ تو نئی عمدہ باتوں کو اختیار کرتے ہیں، نہ پرانی سے کام لیتے ہیں''، تاریخ کے تعلق سے اور بھی کئی اہم باتیں کہی گئی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے نہیں نظر انداز کیا جارہا ہے، البتہ زیب النسا پر علامہ کے مضمون کو عطیہ فیضی نے ''بے مزہ'' بتایا تو ان کے قلم سے کیسا دل کش اور مبنی بر حقیقت جملہ نکلا'' واقعیت اسی قدر بے مزہ ہوتی ہے'' اور پھر یہ واقعہ نقل کیا ہے: ''اشعب (۱) نے ایک دفعہ بہت جلدی سے نماز ادا کی، ایک شخص کھڑا دیکھ رہا تھا، اس نے کہا: اتنی جلدی نماز پڑھتے ہو؟ اس نے کہا: بے ریا نماز اتنی ہی مختصر ہوتی ہے''۔

علامہ شبلی کو موسیقی سے بھی شغف تھا لیکن یہ شغف محض نظری تھا، عملی بالکل نہیں تھا، خود اعتراف کرتے ہیں: ''گانا میں خود نہیں جانتا لیکن سمجھ سکتا ہوں یعنی گانا خلاف فن موسیقی ہوگا تو میں بتا سکوں گا کہ خلاف قاعدہ ہے ...... یوں بے قاعدہ گانے میں کتنی ہی عمدہ آواز ہو بیکار ہوجاتی ہے'' تاہم چاہتے ہیں کہ زندگی کے بعض اور شعبوں کی مانند عطیہ بیگم موسیقی میں بھی کمال حاصل کریں، انہوں نے ان سے خواجہ حافظ کے شعر سنے تھے جس سے ان کی خوش آوازی'' کا اندازہ ہوا تھا لیکن یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ انہیں ''ہندوستانی موسیقی سے واقفیت نہیں''، ایک خط میں ان کی خطوط نویسی اور پالیٹکس میں ان کی صحیح الخیالی کی داد دینے کے بعد کس اشتیاق سے تحریر کرتے ہیں: ''ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہوتو تم اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں و أنا أول العابدین''، نہ عطیہ موسیقی سے واقف ہوں گی اور نہ ان کی پوجا ہوگی!

علامہ نے ان خطوط میں اردو اور فارسی شعر فہمی کے سلسلے میں جو نکات بیان کیے ہیں ان کی داد دینا محال ہے، اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا، اس کی بھی مثالیں پیش کی جاتیں، یہاں صرف داغ کے درج ذیل شعر کے تعلق سے ان کے بلیغ اشارے کی نشان دہی پر اکتفا کی جاتی ہے:

بات کرنی تک نہ آتی تھی تمہیں یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

ارشاد فرماتے ہیں: ''ممکن ہے اس شعر اور محاورے کو ہر شخص سمجھ لے لیکن جس شخص کو اردو زبان کا چسکا ہے اور ذوق ہے وہ اس محاورے پر تڑپ جائے گا''۔

خطوط شبلی کا کھلے ذہن سے مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ علامہ شبلی کی عطیہ فیضی سے دل چسپی ایک مشرقی اور مسلمان نوجوان خاتون کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور بروئے کار لانے کی خواہش کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی، البتہ یہ صحیح ہے کہ اس نے ذاتی رنگ بھی اختیار کرلیا تھا، تاہم یار لوگوں نے ان خطوط کو بنیاد بنا کر جو خیالی طوطا مینا اڑائے ہیں وہ ان کی اپنی کج روی اور غلط فہمی ہی کو آشکار کرتے ہیں، ہم کسی شخصیت کے گرد تقدس کا جالا بن لیتے ہیں اور اگر اس میں ہمیں کوئی شگاف نظر آتا ہے تو بدظن ہوجاتے ہیں لیکن مجھ جیسے دنیاداروں کی نظر میں اس طرح کی غلطیاں (اگر انہیں غلطیاں کہا جائے) علامہ شبلی کا مرتبہ فزوں تر کرتی ہیں، وہ عالم دین تھے، مصنف تھے، سیرت نگار تھے، استاد تھے لیکن ساتھ ہی گوشت پوست کے انسان بھی تھے اور گوشت پوست کے

انسان کی خامیوں سے مبرا نہیں تھے، مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تو غبار خاطر کے ایک خط میں یہی لکھا ہے کہ "............ لیکن کیا کہوں، جب کبھی معاملے کے اس پہلو پر غور کیا، طبیعت اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یک سر معصوم بنا دیا جائے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگارِ خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ غلطیاں ضرور کرنی چاہئیں...... غور کیجیے، وہ زندگی ہی کیا ہوئی جس کے دامنِ خشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکے اور وہ چال ہی کیا جو لڑکھڑاہٹ سے یک سر معصوم ہو" (۲)، کہیں ایسا تو نہیں کہ چوں کہ شبلی کا دامن خشک نہیں تھا اور چوں کہ ان کی چال لڑکھڑاہٹ سے معصوم نہیں تھی، اسی لیے وہ آزاد کے مخدوم و مطاع قرار پائے تھے اور ایسے تو بے شمار صاحب نظر گزرے ہیں اور ان میں زاہدانِ شب زندہ دار بھی رہے ہیں (اور آج بھی یقیناً موجود ہوں گے) جو علامہ شبلی نعمانی کو جیسے کہ وہ تھے، عزیز رکھتے تھے اور ان کا دل سے احترام کرتے تھے۔

حواشی

(۱) اشعب بن جبیر (م ۱۵۴ھ): مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے غلام تھے، ظریف الطبع تھے، حدیث بھی روایت کی ہے لیکن طبیعت میں لالچ بہت تھی، یہاں تک کہ الطامع کے لقب سے مشہور ہوئے اور عربی میں ایک مثل وجود میں آئی: اطمع من اشعب طویل عمر میں انتقال ہوا، ادب کی کتابوں میں ان کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔

(۲) غبار خاطر: ساہتیہ اکادمی ایڈیشن، ۱۹۸۳ء، نئی دہلی، ص ۱۵۔

حکیم نجم الغنی خاں رام پوری کا رویہ تاریخ نویسی

(اخبار الصنادید کے حوالے سے)

از:- ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب ☆

حکیم محمد نجم الغنی خاں رام پوری، رام پور کی دیگر عبقری شخصیات کی طرح، ایک ایسی ہمہ دان شخصیت تھے جن کے نام اور کام سے رام پور کو منزلت ملی، ان کا تالیفی کام مختلف علوم و فنون کو محیط ہے، ان کی ۳۴ کتب پر مشتمل فہرست (۱) کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دینیات، ادبیات اور طب کے موضوعات پر کتب تحریر کیں، بعض کتب کی شروح تحریر کیں اور بعض موضوعات پر اتنی تفصیل سے لکھا کہ ایک کتاب کئی جلدوں میں مکمل ہوئی، مثال میں طب کے موضوع پر خزائن الادویہ سات جلدوں پر مشتمل ہے، ان کو شعر و شاعری سے بھی دل چسپی تھی، نجمی تخلص تھا اور ایک مجموعہ کلام مسمّٰی دیوان نجمی ان سے یادگار ہے، انہوں نے تاریخ کے موضوع پر بوہروں کی تاریخ، تاریخ ریاست حیدرآباد، تاریخ اودھ، کارنامۂ راج پوتان، وقائع راجستھان اور اخبار الصنادید تالیف کیں، اخبار الصنادید ان کی شہرت کی اساس بن گئی۔

حکیم نجم الغنی خاں رام پوری کے تصنیفی و تالیفی کارناموں میں اخبار الصنادید (جلد ۱ جو کٹھیر یا روہیل کھنڈ کی تاریخ ہے اور اس سے ہی منسلک جلد ۲ جو تاریخ رام پور ہے) اپنے علاقے کی تاریخ کا سنگ میل بن گئی اور ایک طویل وقفہ گزرنے کے بعد بھی مورخ کی وسعت نظر، تاریخی بصیرت اور ارضِ روہیل کھنڈ کے تاریخی مطالعے کے لیے ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اخبار الصنادید جلد ۱ مقدمہ - افغان کے نسب اور لفظ پٹھان کی تحقیق سے شروع ہو کر نواب احمد علی خاں (م ۲۶ / جولائی ۱۸۴۰ء) کے عہد پر ختم ہوتی ہے، اخبار الصنادید جلد ۲ نواب محمد

☆ ۷۳ - پھول والان، بریلی، یوپی، ۲۴۳۰۰۳۔

سعید خاں (م یکم اپریل ۱۸۵۵ء) کے عہد سے شروع ہو کر نواب حامد علی خاں (م ۳۰ رجون ۱۹۳۰ء) کے عہد کے تالیف کتاب تک کے واقعات کو محیط ہے، خاتمہ کتاب میں ریاست رام پور کا جغرافیہ اور پٹھانوں کی طرز معاشرت کا بیان ہے۔

حکیم نجم الغنی خاں نے اخبار الصنادید کی دونوں جلدوں کو فصول اور ابواب میں تقسیم نہیں کیا ہے، انہوں نے اس سلسلے میں تحریر کیا ہے:

"پہلے زمانے میں ہر ایک کتاب یا رسالہ مقدمہ ابواب، فصول اور خاتمے پر منقسم ہوتا تھا، اب تحریرات انگریزی کی تقلید سے یہ بات اردو میں چھوٹتی جاتی ہے اور کتاب اس طرز سے لکھی جاتی ہے جو اخبار کا ایک مضمون سا معلوم ہوتا ہے"۔(۲)

لہذا انہوں نے وضاحتی عنوانات قائم کر کے واقعات کو اس طرح قلم بند کیا ہے کہ پورا بیان ایک چست مضمون معلوم ہوتا ہے، کتاب میں بعض مضامین مختصر ہیں اور بعض طویل، اخبار الصنادید جلد اول میں "افغان کے نسب اور لفظ پٹھان کی تحقیق" پر مضمون ۱۶ صفحات کو محیط ہے، اس کے برخلاف اخبار الصنادید جلد ۲ میں "واقعات غدر" کا مضمون بحالی امن تک ۶۷ صفحات پر مشتمل ہے، اول الذکر میں کوئی ضمنی عنوان نہیں ہے، موخر الذکر میں متعدد ضمنی عنوانات حسب واقعات ہیں، اس طرح مضامین چھوٹے ہوں یا بڑے انہوں نے عنوانات کو "فہرست مضامین" میں نقل کر دیا ہے جس سے یہ آسانی پیدا ہوگئی کہ کسی ضمنی واقعے کو "فہرست مضامین" میں تلاش کیا جاسکتا ہے، مثال میں "واقعات غدر" میں یہ دیکھنا ہو کہ اس وقت ریاست رام پور کی مشکلات کیا تھیں تو اس کو صفحہ ۶۸ پر ایک مضمون کی شکل میں دیکھا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ فاضل مورخ نے واقعات کے تسلسل میں ان کے وقوع کے ماہ و سال یعنی کرانولوجی کا خیال رکھا ہے، ایک واقعہ دوسرے واقعے سے اتنی مضبوطی سے جڑا ہوا ہے کہ اگر ایک ضمنی واقعے کو بھی سلسلے سے خارج کر دیا جائے تو واقعات کے ماضی وحال کے مابین تال میل ختم ہو جائے گا، مورخ نے ایک ایسی ضخیم کتاب میں جو روہیلوں کی آمد، ان کے عروج و زوال، ریاست رام پور کی تشکیل اور نواب حامد علی خاں کے (م ۳۰ رجون ۱۹۳۰ء) درمیانی عہد تک کو محیط ہے، واقعات کے زمانی تسلسل کو قائم کر کے

مورخانہ ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے، انہوں نے پوری کتاب میں واقعات کی تاریخوں کو درج کرنے کا اہتمام کیا ہے جس سے واقعات کی کڑیاں مسلسل ہوگئی ہیں۔

مورخ نے اخبار الصنادید کے منابع کا ذکر "طریق تعلیم" کے زیر عنوان کیا ہے اور وہ منابع یہ ہیں:

۱- روہیلوں کے بیان میں جس قدر تاریخیں دست یاب ہوئیں ان سے نقل کیا ہے۔

۲- معتمد اور ثقہ لوگوں کے بیانات تحریری و تقریری کو جمع کیا ہے۔

۳- جو کچھ نظر سے گزرا اور دیکھا، وہ لکھا ہے۔(۳)

ہمارے بزرگوں کے سامنے یہی منابع تھے جن سے وہ تاریخ نویسی کا فرض ادا کرتے تھے۔

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں جو حکیم نجم الغنی خاں رام پوری کے ذہنی و ادبی سفر کا زمانہ ہے، انگریز محققین نے آثار قدیمہ کی دریافت اور ان کی تاریخی اہمیت پر کام بڑے پیمانے پر کیا تھا اور ان کی ارض کاوی کی رپورٹیں، تاریخی کتبات اور سکہ جات پر مضامین شائع ہوتے رہتے تھے، کٹھیر کے وہ علاقے جو ریاست رام پور میں معاہدۂ لال ڈانگ (۷ر اکتوبر ۱۷۷۴ء) کے بعد شامل ہوئے تھے، ان میں کابر کے گاؤں کی قدامت، کٹھیر یا راج پوتوں کا اقتدار اور ان کی افواج دہلی سے لڑائیاں، تاریخی نقطہ نظر سے اہم تھے، نواب فیض اللہ خاں (م ۱۷ر جولائی ۱۷۹۴ء) کی جاگیر میں شاہ آباد یعنی لکھنور کا علاقہ معاہدۂ لال ڈانگ سے پہلے شامل تھا جو زمانہ قدیم میں کٹھیر یا راج پوتوں کا مرکز اقتدار تھا، ان قدیم تاریخی مقامات کی سیاحت، قدیم خاندانوں کے افراد سے ملاقات، لوک کہانیوں سے واقفیت اور محکمۂ آثار قدیمہ کی رپورٹوں کا مطالعہ اپنی جگہ اہم ذرائع معلومات تھے، حکیم نجم الغنی خاں رام پوری کے ایک معاصر مولوی رضی الدین بسمل بدایونی (م ۱۹۲۵ء) نے تاریخ بدایوں یعنی کنز التاریخ (۴) مطبوعہ ۱۹۰۷ء میں آثار قدیمہ کی مذکورہ معلومات سے پورا استفادہ کیا تھا، حکیم نجم الغنی خاں رام پوری نے زیر عنوان "ملک کٹھیر کی قدیم تاریخ کا تذکرہ اور اس کے سلسلے کا روہیلوں سے اتصال" (۵) گزیٹیر ممالک متحدہ جلد نہم حصہ شاہ جہاں پور کا حوالہ دیتے ہوئے کٹھیر کو پنچالہ سلطنت کا حصہ لکھا اور طبقات ناصری (۶) کے حوالے سے کٹھیریوں کے احوال بیان کیے، یہ حوالے درست تھے لیکن ان کو آثار قدیمہ کی

دریافتوں سے تقویت نہیں مل سکی۔

حکیم نجم الغنی خاں نے تحریر کیا تھا کہ ان کو روہیلہ تاریخ کے بیان میں جتنی کتب دستیاب ہوئیں ان سے واقعات اخذ کیے ہیں، اخبار الصنادید کی دونوں جلدوں میں جن کتابوں کے حوالے ملتے ہیں ان کی الفبائی فہرست یہ ہوسکتی ہے:

اخبار الصنادید جلد ۱ اکسیر اعظم، انتخاب یادگار، اخبار حسن، آئینہ محمدی، آئینہ اکبری، بیان واقع، تاریخ فرشتہ، تاریخ فرخ آباد از ولی اللہ، تاریخ فرخ آباد از آرون، تاریخ مالوہ، تاریخ سادات بارہ، تاریخ راجگان پنجاب، تاریخ راجگان الفنسٹن، تاریخ روہیل کھنڈ، تاریخ سلاطین متاخرین، تاریخ مظفری، تاریخ ہندوستان از ذکاءاللہ، تاج فرخی، تنقیح الاخبار، تکملہ ذکر ملوک، تذکرہ حکومت المسلمین، جام جہاں نما، جنگ نامہ دو جوڑہ از معظم، جنگ نامہ دو جوڑہ از تسلیم، جنگ نامہ ضابطہ خاں، حیات افغانی، حسین شاہی، خلاصۃ الانساب، خزانۂ عامرہ، روہیل کھنڈ گزیٹیر، سیر المتاخرین، سفرنامہ بن گڈھ، شاہ نواز خانی، شاہ جہان پور گزیٹیر، طبقات ناصری، طبقات الشعرا، طلسم ہند، عماد السعادت، فرح بخش، فرہنگ آصفیہ، فصل الکلام، قانون خاندان، قیصر التواریخ، گل رحمت، مراد آباد گزیٹیر، مخزن افغانی، ساکن فلفی، منتخب العلوم، ماثر الامرا، مرأت آفتاب نما، مصطلحات وارستہ، وقائع راج پوتانہ، ہفت اقلیم۔

اخبار الصنادید جلد ۲ الطاعون، تاریخ جلسۂ قیصری، سوانح عمری لارنس صاحب، سرگزشت شاہ دہلی، نسخۂ سعیدی، ان کتب کے علاوہ خطوط، مراسلات، اقرار نامے، رپورٹوں اور دیگر دستاویزات کے حوالے ملتے ہیں، یہ حوالے کافی تعداد میں ہیں جو کتب خانہ رام پور اور دار الانشا رام پور میں محفوظ ہوں گے۔

حکیم نجم الغنی خاں رام پوری نے کتب کے نام تو بالالتزام تحریر کیے لیکن مصنفین کے اسما پابندی سے نہیں لکھے، یہ بھی مطالعے میں آیا کہ انہوں نے نفس مضمون میں مصنفین کے نام تحریر کیے جیسے کارلائل، الگزنڈر، ہملٹن، خواجہ بشیر وغیرہ لیکن ان کی تالیفات کے نام نہیں لکھے، کتابوں کی متذکرۂ بالا فہرست میں انگریزی فارسی اردو کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتب شامل ہیں جو موضوع تاریخ کے علاوہ فرہنگ و مصطلحات، انساب، تذکرات، طب، دواوین شاعری، سوانح عمری، سرکاری

رپورٹوں، عہد ناموں، خطوط، مراسلات اور دستاویزات پر مشتمل ہیں، مختصر یہ کہ تاریخی وغیر تاریخی ماخذات کے پیش نظر مورخ کا یہی منشا معلوم ہوتا ہے کہ حسب ضرورت معلومات جہاں بھی دست یاب ہوں، ان کو حاصل کرلیا جائے اور ایک چھوٹے علاقے کی محدود زمانے کی تاریخ کو واقعات کے ذریعہ وسعت دی جائے، مورخ نے محنت اور سلیقے سے معلومات کو جمع کر کے ان کو نہایت ہنرمندی سے ایک سلک میں پرودیا ہے۔

تاہم جدید ذہن میں الجھن پیدا ہوتی ہے، نامکمل حوالوں کو تلاش کرنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ مورخ نے مصنف کا نام بتائے بغیر جس کتاب کا نام "بیان واقع" لکھا ہے، وہ دراصل خواجہ عبدالکریم کشمیری کی تصنیف کردہ تاریخ نادر شاہی ہے جس میں اس نے نادر شاہ کے حالات اور دلی کی تباہی کے چشم دید واقعات قلم بند کیے ہیں (۷) یا مورخ نے جس کتاب کا نام "تاج فرخی" لکھا ہے وہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے، نواب کلب علی خاں (م ۲۴/ مارچ ۱۸۷۷ء) کی نظم فارسی کا ایک مختصر سا دیوان ہے۔(۸)

اخبار الصنادید کی دونوں جلدوں میں کتابوں کے نام دیکھنے کے بعد جو بہ طور ماخذ استعمال ہوئی ہیں، یہ مستفاد ہوتا ہے کہ مورخ نے بعض کتب سے زیادہ استفادہ کیا اور بعض سے کم، مورخ نے جن کتب سے زیادہ استفادہ کیا ان کے نام ہیں: تاریخ اخبار حسن، تنقیح الاخبار، حیات افغانی، حسین شاہی یعنی تاریخ احمد شاہی، سیر المتاخرین، عماد السعادت، فرح بخش، منتخب العلوم، مرأت آفتاب نما وغیرہ، مورخ نے جن کتب سے کم استفادہ کیا ان کے نام ہیں: طبقات ناصری، آئین اکبری، تاریخ فرشتہ، تاریخ مظفری وغیرہ، ان ماخذوں پر نظر ڈالنے سے جن کو مورخ نے زیادہ استعمال کیا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی باہمی نوعیت مختلف ہے، مثال میں گل رحمت، گلستان رحمت، تاریخ سلیمانی اور تاریخ اخبار حسن نواب حافظ رحمت خاں کے افراد خاندان (۹) کی تالیفات ہیں جن میں انہوں نے اپنے نقطہ نظر کو سامنے رکھا ہے، ان کے برخلاف سید غلام حسین طباطبائی کی تاریخ مسمی سیر المتاخرین میں روہیلوں سے کینہ وعداوت کی بو آتی ہے کیوں کہ اس کا باپ سید ہدایت علی خاں بریلی کا فوج دار تھا جس کو روہیلوں کے ہاتھوں زک پہنچی اور بریلی چھوڑ کر جانا پڑا تھا اور اس محاربے میں خود سید غلام حسین موت سے بال بال بچا تھا (۱۰)، اس کے

متعلق حکیم نجم الغنی خاں رام پوری نے تحریر کیا "وہ روہیلوں اور خصوصاً نواب علی محمد خاں کا دشمن جانی رہا" (۱۱)، اسی ضمن میں علاقہ اودھ کے مورخین کا شمار کرنا ہوگا جو شجاع الدولہ کے حامی اور روہیلوں کے مخالف تھے، مثال میں عماد السعادت کے مصنف سید غلام علی نقوی لکھنوی نے شجاع الدولہ اور اودھ کے مفاد کی حمایت کی، ان کے علاوہ بعض کتب میں مورخین نے انگریزوں کے مفاد کا خیال رکھا اور ان کے اشارے پر ان کو خوش کرنے کے لیے تاریخیں تحریر کیں جیسے شو پرشاد کی فرح بخش اور نیاز احمد خاں ہوش بریلوی کی تاریخ روہیل کھنڈ۔

حکیم نجم الغنی خاں رام پوری کی تاریخ نویسی کا رویہ کچھ ایسا تھا کہ انہوں نے آپس میں متخالف کیفیات کی کتب سے مفید مطلب استفادہ کیا اور حسب ضرورت معلومات جمع کیں، ان کی نظر واقعات کی تفصیل پر تھی جو انہوں نے جہاں منتخب العلوم، تنقیح الاخبار، مرأت آفتاب نما اور تاریخ احمد شاہی وغیرہ سے جمع کیں وہاں انہوں نے گل رحمت، سیر المتاخرین اور فرح بخش سے بھی استفادہ کیا، انہوں نے کسی تاریخ کو اس بنیاد پر رد نہیں کیا کہ اس کا مصنف انگریز دشمن تھا یا دوست، روہیلوں سے عناد رکھتا تھا یا ان کا خیر خواہ تھا، انہوں نے اس زمانے کے طریقۂ تاریخ نویسی کے مطابق ہر کتاب سے معلومات جمع کرکے مفصل واقعاتی مضامین تالیف کیے، ان کا منشا زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنا تھا، خواہ ان کے ماخذات آپس میں متخالف ہوں یا غیر تاریخی، انہوں نے یہ کام دیدہ ریزی اور دیدہ وری سے کیا جو اپنی مثال آپ ہے۔

حکیم نجم الغنی خاں رام پوری نے ایک اہم کام یہ کیا کہ واقعہ نگاری میں واقعات کی تاریخیں نقل کیں، ان کے اس رویے کی اہمیت کا اندازہ اس مثال سے ہوگا کہ جب انہوں نے "بادشاہ دہلی اور مرہٹوں کی ضابطہ خاں کے ملک پر چڑھائی" (۱۲) یعنی جنگ سکرتال کا واقعہ بیان کیا تو مرہٹہ فوج کے گنگا کو عبور کرنے کی تاریخ ۱۱ر ذی قعدہ ۱۱۸۵ھ بہ وقت نصف شب تحریر کی تھی (۱۳)، دیگر مورخین تاریخ روہیلہ نے جنگ سکرتال کے ذکر میں نہ سن ہجری کا واضح اشارہ دیا اور نہ مادہ تاریخ اور وقت کا اندراج کیا (۱۴)، لہذا حکیم نجم الغنی خاں کی یہ اطلاع (بدون حوالہ) نہایت اہم بن گئی جس کی صداقت کا ثبوت جنگ سکرتال سے متعلق ایک قلمی دستاویز میں مل گیا جس میں مرہٹوں کے گنگا کو عبور کرنے کا وقت اور تاریخ نقل کی گئی ہے، راقم الحروف نے اپنے

ایک مضمون "جنگ سکرتال ۱۱۸۵ھ" میں اس دستاویز کا حوالہ دیا ہے (۱۵)، معلوم ہوا کہ حکیم نجم الغنی خاں تاریخیں نقل کرنے میں کتنے مستعد تھے اور ان کی واقعات کی صحت پر نظر کتنی گہری تھی۔

حکیم نجم الغنی خاں رام پوری نے "واقعات غدر ۱۸۵۷ء" سے متعلق ایک ضمنی عنوان "انتظام رسد رسانی نینی تال" (۱۶) کے تحت اس مدد کی تفصیل پیش کی جو ریاست رام پور کی طرف سے ان انگریزوں کو دی گئی تھی جو اپنی جان بچا کر نینی تال میں پناہ گزیں ہو گئے تھے، ایسی تفصیل کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ملتی، لہذا واقعات غدر ۱۸۵۷ء کے ذیل میں یہ معلومات کافی اہم بن گئیں جن سے مورخینِ مابعد نے استفادہ کیا۔

ان مثالوں کے علاوہ اخبار الصنادید جلد ۲ میں جو مورخ کے عصر کی تاریخ ہے اور جن واقعات کو "بہت کچھ نظر سے گزرا دیکھا ہے" مورخ نے نہایت تفصیل اور سلیقے سے نوابین رام پور کے عہدِ حکومت میں جو اصطلاحات، بندوبست، قانون و معدلت اور شہر کے انتظام میں ہوئیں، بیان کیا ہے، اس کے علاوہ شہر رام پور میں بجلی اور ٹیلی فون کی سہولت کا آغاز، کارخانوں کا کھلنا، قلعے کی عمارات کی تعمیر، کتب خانہ، عزاداری اور علمی و ادبی سرگرمیوں پر معلومات فراہم کی ہیں، بعض مشہور واقعات جیسے اعظم الدین خاں کا قتل (۳ر اپریل ۱۸۹۱ء) بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے، آخر میں بہ عنوان "اخبار الصنادید کا خاتمہ" (۱۷)، ریاست رام پور کا جغرافیہ، وہاں کی اقوام، ان کا طرز معاشرت، پٹھانوں کا طرز معاشرت، مراسم و دستورات وغیرہ کی معلومات دست یاب ہیں، اس طرح انہوں نے اخبار الصنادید جلد ۲ میں ریاست رام کی تاریخ کے ساتھ وہاں کی ثقافتی سرگرمیوں کو بھی پیش کیا ہے جو ان کی وسعت نظر کا ثبوت ہے۔

حکیم نجم الغنی خاں رام پوری نے واقعات کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتے ہوئے ان اختلافی آرا پر بھی نظر رکھی جو مورخین کے مابین تھی، انہوں نے اپنی رائے ضرور دی لیکن کسی واقعے سے متعلق مختلف روایات کو نظر انداز نہیں کیا اور اشتباہ کو دور کرنے کی سعی کی، انہوں نے اس مقصد کے لیے فٹ نوٹ تحریر کیے اور نفس مضمون میں "تنبیہ" کے تحت امر متنازعہ پر بحث کی، مثال میں انہوں نے فٹ نوٹ میں نواب سعد اللہ خاں بن نواب علی محمد خاں کی عمر کے متعلق مورخین کی مختلف آرا کو پیش کرکے ان کی وفات کی سن ۱۱۷۵ھ یا ۱۱۷۶ھ کے پیش نظر ۲۷ سال مقرر کی (۱۸)،

دوسری مثال چالیس لاکھ کے اس تمسک کی ہے، جو نواب حافظ رحمت خاں نے لکھ کر شجاع الدولہ کو دیا تھا، انہوں نے اس امر پر "تنبیہ" کے تحت اپنی رائے ضرور دی لیکن متنازعہ روایات ان کے علم میں تھیں، ان کو نقل کر دیا (۱۹)، انہوں نے اس طرح قاری کو بھی امر متنازعہ کی پوری تفہیم کا موقع دیا تاکہ وہ بحث کا مطالعہ کر کے خود بھی کوئی فیصلہ کر سکے، اس کے علاوہ انہوں نے قاری کی اطلاع کے لیے واقعہ مذکورہ میں بعض معروف افراد اور قصبات کے اسما پر اختلافی روایات کو بیان کر کے ان کے صحیح اسما پر بھی فٹ نوٹ میں روشنی ڈالی ہے، مثلاً انہوں نے مہاجی سندھیا کے نام پر بحث کر کے اطلاع دی کہ دراصل اس کا نام مادھوجی تھا جو کتب تواریخ میں مہاجی مشہور ہو گیا (۲۰)، اسی طرح انہوں نے بعض مقامات اور الفاظ پر فٹ نوٹ تحریر کیے، مثال میں انہوں نے جنگ سکرتال کے بیان میں تحریر کیا:

> "سکرتال لفظ ہندی ہے، سین مہملہ مضموم اور کاف تازی مشدد اور رائے مہملہ ساکن اور تائے قرشت اور الف اور لام سے، یہ مقام میرٹھ سے شرقی وشمالی جانب ۱۴ کوس کے فاصلے پر ہے"۔ (۲۱)

انہوں نے لفظ بیہڑ کے متعلق تحریر کیا:

> "بیہڑ بائے موحدہ کے کسرے اور یائے تحتانی مجہول اور ہائے ہوز مفتوح اور رائے ثقیل کے سکون سے اور یائے معروف بھی آیا ہے جیسا کے فرہنگ آصفیہ میں ہے، ناہموار اور اونچی زمین اور وہ زمین جس پر بڑے غار اور نالے ہوں یا دریا اور ندی کے قریب کی زمین"۔ (۲۲)

حکیم نجم الغنی خاں رام پوری کے اس رویے سے مستفاد ہوتا ہے کہ ان کی نظر واقعات کی جزئیات پر بھی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ قاری دوران مطالعہ واقعے سے بہ خوبی واقف ہو جائے، اس طرح فٹ نوٹ اور تنبیہ کی تحریروں سے واقعات کی اہمیت اور حقیقت کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔

حکیم نجم الغنی خاں نے اس عہد کی تاریخ نویسی کی روش کے مطابق واقعات کو جزئیاتی تفصیل کے ساتھ قلم بند کرتے ہوئے ماخذات کے حوالوں کو درج کرتے وقت کسی مقررہ اصول کی پابندی نہیں کی، معلومات کا انبار اور قلم کی تیز رفتاری، ایک چھوٹے علاقے کی محدود وقت کی تاریخ اور زیادہ سے زیادہ واقعات کو بیان کرنے کی کوشش، ایسے میں ماخذوں کے حوالہ جات کا مناسب اہتمام کیوں کر ہوتا، اخبار الصنادید میں حوالہ جات کا بندوبست کچھ اس طرح کا ہے:

۱- کہیں مصنف کا نام دیا ہے کتاب کا نہیں، جیسے "ہملٹن لکھتا ہے (۲۳)" یا "مستجاب خاں کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے" (۲۴)۔

۲- کہیں کتاب کا نام دیا ہے مصنف کا نہیں، جیسے "بقول مصنف سیر المتاخرین" (۲۵) یا بالعموم اس طرح "تنقیح الاخبار میں مذکور ہے"، فرح بخش میں ذکر کیا ہے"۔

۳- کہیں مصنف اور کتاب دونوں کے نام نہیں دیے ہیں، جیسے "یہ بیان ایک اردو تاریخ کے مطابق ہے جو پرانے زمانے کی تالیف ہے اور رام پور میں ملکیوں میں اس کا نسخہ تھا" (۲۶) یا "کتب تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے" (۲۷) یا "بعض مورخ لکھتے ہیں" (۲۸)۔

۴- جو حوالے فٹ نوٹ میں درج کیے ہیں، وہاں بھی کبھی مصنف اور کتاب دونوں کا نام نقل کیا ہے اور کبھی نہیں، صفحہ یا ورق کا نمبر درج نہیں کرتے اور ۱۲ کا ہندسہ لکھ کر عبارت ختم کر دیتے ہیں۔

۵- عام طور پر اقتباسات درج نہیں کیے ہیں، کہیں اقتباس دیا ہے تو اپنی رائے کی تائید میں اور اپنے موقف کو مضبوط کرنے کے لیے، جیسے غلام حسین طباطبائی کی تالیف سیر المتاخرین میں نواب فیض اللہ خاں کے خلاف اس کے حاسدانہ رویے پر اظہار خیال کرتے ہوئے۔ (۲۹)

۶- معتمد اور ثقہ لوگوں کے بیانات جو ان کی معلومات کا ایک ذریعہ ہیں، ان کا حوالہ فٹ نوٹ میں ہی دیا ہے، جیسے "زبانی حکیم محمد اعظم خاں مولف اکسیر اعظم و قرابادین اعظم و محیط اعظم وغیرہ ابن شاہ اعظم خاں ابن رضی خاں"۔ (۳۰)

حقیقت یہ ہے کہ حوالہ جات، تعلیقات، حواشی کا جس دیدہ ریزی سے اس زمانے میں اہتمام کیا جاتا ہے، حکیم نجم الغنی خاں رام پوری کے عہد میں ان کی اتنی اہمیت نہیں تھی اور واقعہ نگاری میں صرف مصنف یا تالیف کا حوالہ دینا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔

حکیم نجم الغنی خاں صاحب علم و فضل تھے، ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، مختلف علوم و فنون پر تالیفی کام کے سلیقے سے واقف تھے، اس کے باوصف اخبار الصنادید کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ

مولف نے معروضی طریقہ اظہار اختیار کر کے واقعات کو سادہ سلیس اور عامۃ الورود زبان میں تحریر کیا ہے، ان کی عبارت بیانیہ اور واقعاتی ہے جو واقعات کے لہجے اور مزاج کے مطابق مسافت طے کرتی ہے، ان کی تحریر جوش و جذبے سے عاری ہے، ان کی تحریر مدلل ہوتی ہے اور بحث غیر جانب دارانہ، ان کے فیصلے دوٹوک الفاظ میں ہوتے ہیں اور ایسی مثالیں شاذ ہیں کہ اخذ نتائج کے وقت ان کے ذاتی ردعمل کا اشارہ ملا ہو۔

خلاصہ کلام یہ کہ حکیم نجم الغنی خاں رام پوری کو اپنے وطن اور اسلاف سے بہت محبت تھی، ماضی شناسی سے دل چسپی تھی اور حالات حاضرہ کو جاننے اور جمع کرنے کا شوق تھا، انہوں نے ماضی کے واقعات اور اسلاف کے کارناموں کو درجنوں کتابوں سے جمع کیا، حالات حاضرہ کو جیسا دیکھا اور ثقہ لوگوں کی زبانی سنا، یکجا کیا اور جملہ واقعات کو کتابی شکل میں تالیف کردیا، اخبار الصنادید جلد ۱ ان کی ماضی شناسی کی، اخبار الصنادید جلد ۲ ان کے دیدہ وشنیدہ حالات سے باخبری کی مثالیں ہیں، ان کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے روہیل کھنڈ اور ریاست رام پور کے ماضی و حال کے واقعات کو نہایت کاوش سے جمع کر کے تاریخ کی شکل میں تالیف کردیا، ان کے عہد میں تاریخ نویسی کا یہی معیار تھا کہ واقعات کو تفحص کے ساتھ جمع کر کے مرتب کیا جائے اور اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر و مباہات کا اظہار کیا جائے، اخبار الصنادید روہیل کھنڈ اور ریاست رام پور کی تاریخ قدیم وجدید ہے جس میں اس علاقے کے واقعات اور اسلاف کے کارناموں کا ذخیرہ ہے۔

اب یہ صورت بدل گئی ہے، اس زمانے میں تاریخ کے طالب علم کو فلسفہ تاریخ، تاریخ کی تعریف، وسعت، معروضیت، مواد، ترتیب، شہادت، فیصلہ، وجوہ، محدودات، تفتیش حالات، تاریخی ارتقا کا تصور اور فرد کے عنوانات پر مطالعہ کرنا پڑتا ہے جن کی تفہیم کے بغیر تاریخ نویسی کا فرض پورا نہیں ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ اب مورخ کو واقعات کے علاوہ ان محرکات کو بھی تلاش کرنا پڑتا ہے جو واقعہ ہونے کا سبب بنے تھے، لہذا اب صرف واقعات کا جمع کرنا تاریخ نویسی نہیں ہے البتہ تاریخ نویسی کی بنیاد ضرور ہے، اب کسی واقعے کو نقد و تقابل کے ذریعہ اور مناسب تفتیش اور شہادت کے بعد ہی قبول کیا جاتا ہے، اب تاریخ میں انسانی حیات کے مظاہر کو بھی تلاش کیا جاسکتا ہے کیوں کہ فرد سماج میں جیتا ہے اور سماج تاریخ میں، یہی وجہ ہے کہ جدید تاریخ کی موشگافیوں

اور فکری گہرائی نے قدرے ژولیدگی پیدا کردی ہے۔

تاہم حکیم نجم الغنی خاں کی تاریخ اخبار الصنادید اپنے دور کے معیار تاریخ نویسی کا اعلا نمونہ ہے اور تاریخ کے جدید نظریاتی دور میں اس کی افادیت میں کمی نظر نہیں آتی کیوں کہ وہ معلومات کا خزانہ ہے جس سے استفادہ کیے بغیر اس علاقے کی جدید تاریخ کو مکمل نہیں کیا جاسکتا۔

حوالہ جات وحواشی

(۱) وفیات مشاہیر اردو، ص ۶۰۰ (۲) اخبار الصنادید، ج ۱، ص ۲۲ (۳) ایضاً (۴) کنز التاریخ، تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۱۹ھ (مطابق ۱۹۰۱ء) کے اعداد برآمد ہوتے ہیں لیکن یہ کتاب چھ سال بعد نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی تھی (۵) اخبار الصنادید، ج ۱، ص ۵۴ (۶) طبقات ناصری کا مولف ابو عمر منہاج السراج تحتانی تھا، اس نے طبقات ناصری کو ۶۵۸ھ/ ۱۲۶۰ء میں مکمل کیا، اس نے یہ کتاب شمس الدین التتمش (م ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۶ء) کے پسر سلطان ناصر الدین محمود (م ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۶ء) کو معنون کی تھی، رک تذکرۂ مورخین مرتبہ چودہری نبی احمد سندیلوی، ص ۳۵ (۷) رک مضمون "لاہور کے علمی تحائف" از سید صباح الدین عبدالرحمان، ماہنامہ معارف اعظم گڈھ، مئی ۱۹۷۸ء (۸) اخبار الصنادید، ج ۲، ص ۳۳۴ (۹) مستجاب خاں مولف گلستان رحمت بن نواب حافظ رحمت خاں ۲- سعادت یار خاں مولف گل رحمت بن حافظ محمد یار خاں بن نواب حافظ رحمت خاں ۳- سلیمان خاں اسد مولف تاریخ سلیمانی بن محمد موسیٰ خاں بن محبت خاں بن نواب حافظ رحمت خاں ۴- محمد حسن رضا خاں مولف تاریخ اخبار حسن بن کامگار خاں بن اللہ یار خاں بن نواب حافظ رحمت خاں، رک حیات حافظ رحمت خاں از سید الطاف علی بریلوی، ص ۳۵۴، ۳۲۸، ۳۲۶، ۳۴۳ علی الترتیب (۱۰) تاریخ روہیل کھنڈ، عاصی، ص ۴۲ (۱۱) اخبار الصنادید، ج ۱، ص ۸۷ (۱۲) ایضاً، ص ۳۹۹ (۱۳) ایضاً، ص ۴۹۹ (۱۴) بیسویں صدی عیسوی کے معروف مورخین روہیلہ سید الطاف علی بریلوی اور عبدالعزیز خاں عاصی بریلوی نے حیات حافظ رحمت خاں (ص ۱۷۱) اور تاریخ روہیل کھنڈ (ص ۷۰) میں جس طرح مرہٹوں کے ضابطہ خاں کے علاقے پر حملے کا ذکر کیا ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جنگ سکرتال ۱۷۷۰/ ۱۷۷۱ء کے بعد ہوئی تھی، البتہ مولوی عبدالحق نے تذکرۂ ہندی کے مقدمے میں جنگ سکرتال کا سن ۱۱۸۵ھ قلم بند کیا ہے

لیکن ماہ تاریخ اور وقت کا ذکر انہوں نے بھی نہیں کیا ہے، رک مقدمہ تذکرۂ ہندی از مولوی عبد الحق

(۱۵) رک، ماہنامہ ضیاء وجیہ، رام پور، مارچ ۲۰۰۲ء (۱۶) اخبار الصنادید، ج ۲، ص ۶۹ (۱۷) ایضاً، ص ۴۸۰ (۱۸) ایضاً، ج ۱، ص ۱۸۷ تا ۳۵۳ (۱۹) ایضاً، ج ۱، ص ۴۱۴ تا ۴۲۰ (۲۰) ایضاً، ج ۱، ص ۳۹۸ (۲۱) ایضاً، ج ۱، ص ۳۰۸ (۲۲) ایضاً، ج ۱، ص ۳۱۳ (۲۳) ایضاً، ج ۱، ص ۲۳۶ (۲۴) ایضاً، ج ۱، ص ۳۵۳ (۲۵) ایضاً، ج ۱، ص ۲۱۴ (۲۶) ایضاً، ج ۱، ص ۷۰ (۲۷) ایضاً، ج ۱، ص ۴۶۷ (۲۸) ایضاً، ج ۱، ص ۱۷۶ (۲۹) ایضاً، ج ۱، ص ۹۳ (۳۰) ایضاً، ج ۱، ص ۳۲۹۔

کتابیات

الطاف علی، سید، بریلوی، حیات حافظ رحمت خاں، طبع ثالث، ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس کراچی، ۱۹۸۰ء۔

افضال الرحمان، ڈاکٹر، روہیل کھنڈ میری ٹری، کیتھران میڈیو انڈیا، ۱۲۰۰ء تا ۱۷۰۷ء (انگریزی) ،مفنیسٹ آفسیٹ پرنٹرس نئی دہلی، ۱۹۹۵ء۔

اقبال حسین، ڈاکٹر، دی روہیلہ چیف ٹینیس (انگریزی) آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، دہلی ۱۹۹۴ء۔

بشارت علی خاں فروغ، وفیات مشاہیر اردو، کلکتہ آفسیٹ پریس، نئی دہلی ۲۰۰۰ء۔

جھر کنڈ چوبے، ڈاکٹر، اتہاس درشن (ہندی) وارانسی الیکٹرانک کلر پرنٹرس پرائیویٹ لمیٹڈ وارانسی ۱۹۹۱ء۔

رضی الدین، مولوی، بسمل، بدایونی، کنز التاریخ، نظامی پریس بدایوں ۱۹۰۷ء۔

ضیاء وجیہ، رام پور، ماہنامہ مارچ ۲۰۰۲ء۔

عبد العزیز خاں عاصی، بریلوی، تاریخ روہیل کھنڈ، رشید آرٹ پریس کراچی ۱۹۶۳ء۔

غلام ہمدانی مصحفی، تذکرۂ ہندی (فارسی)، مرتبہ عبد الحق، جامع برقی پریس دہلی ۱۹۳۳ء۔

معارف، اعظم گڈھ، ماہنامہ، مئی ۱۹۷۸ء۔

نجم الغنی خاں، حکیم محمد، رام پوری، اخبار الصنادید، دو جلد، مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱۹۱۸ء۔

نبی احمد، چودھری، سندیلوی، تذکرۂ مورخین، جاوید پریس کراچی ۱۹۶۸ء۔

برصغیر پاک و ہند میں تفاسیر و تراجم کا آغاز و ارتقا

از:- ڈاکٹر عبدالرحیم ☆

''اسلامی علوم کی خدمت میں برصغیر کے مسلمانوں کے کارنامے اسلامی ملکوں سے کم نہیں لیکن ان میں اور یکجہتی اور بدیع الخیالی نہیں ہے مگر برصغیر کے علما و مصنفین کا اور ان کی تصنیفات کا ایسا مبسوط جائزہ نہیں لیا گیا ہے جس سے ان کی عظمت اور ان کے کاموں کی واقعی قدر و قیمت کا اندازہ ہو، علم تفسیر کی جانب بہت کم اعتنا کیا گیا ہے، اس لحاظ سے یہ مقالہ گو غنیمت ہے مگر یہ جائزہ نامکمل ہے، اولاً تو مقالہ نگار کو شمالی ہندوستان کے علما کی خدمات سے زیادہ آگاہی نہیں ہے، ثانیاً موضوع سے متعلق ان کو اصل ماخذ اور مواد کا بھی زیادہ پتا نہیں اور وہ دوسرے اور تیسرے درجے کے ماخذ کو کام میں لائے ہیں، ثالثاً جو تفسیریں اور کتب قرآنی متعدد بار طبع ہو چکی ہیں اور وہ آسانی سے یا کسی قدر کاوش سے دست یاب ہو سکتی تھیں، ان کو ان کا بھی علم نہیں اور اگر علم تھا تو وہ ان سے براہ راست فائدہ نہیں اٹھا سکے، اس لیے عموماً ان کا مقالہ داخلی ثبوت و شواہد سے خالی ہے، اس کے باوجود موضوع کی اہمیت کی بنا پر یہ مقالہ شائع کیا جا رہا ہے، تا کہ اس موضوع سے جن لوگوں کو دلچسپی ہو وہ اس کی کمی کو پورا کر سکیں، دوسرے اس میں شبہ نہیں کہ پشتو اور سندھی زبانوں میں ہونے والی قرآنی خدمات سے عام اردو داں طبقہ بہت بے خبر ہے، اس مقالے سے اس کے علم میں ضرور اضافہ ہوگا، اس موضوع پر لکھنے کے لیے فارسی ماخذ کو کھنگالنا ضروری تھا''۔ (ض)

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ عربی بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان۔

ہر دور اور ہر علاقہ کے علمائے کرام نے قرآنی مطالب کی تشریح وتوضیح میں قابل رشک خدمات سرانجام دی ہیں، برصغیر کے مختلف المسالک جید علمائے کرام نے بھی اس ضمن میں نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر عہد کا مفسر اپنے عہد کے فکری ماحول سے متاثر ہوتا ہے، چنانچہ جس عہد میں جو علمی فضا اور علمی ماحول تھا اور اس میں جن مسائل کی گونج تھی، اسی کے پس منظر میں اس نے قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی، اردو زبان میں بارہویں، تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری میں بہ کثرت تفاسیر برصغیر پاک و ہند میں تحریر کی گئی، اردو زبان کے علاوہ اس خطہ میں عہد بہ عہد عربی اور دیگر علاقائی زبانوں میں بھی قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر پر بہت سی علمی، ادبی اور تحقیقی کتب سامنے آئی ہیں، اس مقالہ میں ان ہی تفاسیر وتراجم کا ایک جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ابن عیینہ کی کتاب التفسیر پر محمد بن ابی جعفر الدیبلی کے حاشیہ کا ذکر ملتا ہے، غزنوی عہد میں شیخ محمد اسماعیل لاہوری (۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء) لاہور تشریف لائے، انہیں برصغیر کا اولین مبلغ اسلام اور تفسیر قرآن کا معلم اول کہا جاتا ہے، عہد سلاطین (۱۲۰۶ تا ۱۳۹۶ھ/ ۶۰۳ تا ۸۰۱ء) میں حفظ قرآن اور تفسیر "الکشاف" کی تدریس جاری تھی۔

عہد تغلق میں شیخ ابوبکر بن التاج البکری الملتانی (م ۷۳۰ھ/ ۱۳۷۵ء) کی کتاب "خلاصہ جواہر القرآن فی بیان معانی الفرقان" از غزالی منظر عام پر آئی، اسی عہد میں دوسرے پارے کی تفسیر بہ عنوان "تفسیر تاتارخانی" از امیر تاتارخان یا محمد بن عبدالملک بغدادی اور مخلص بن عبدالدہلوی (۷۶۳ھ/ ۱۳۶۲ء) کی تفسیر "کشف الکشاف" لکھی گئی۔

نویں صدی ہجری کے آغاز اور دسویں صدی ہجری کے ربع اول تک کے عرصہ میں "کشاف" کا انداز لیے ہوئے اور تصوف کے رنگ میں سید محمد گیسودراز (م ۱۴۴۲ء) کی تفسیر القرآن الکریم، علی بن احمد المہائمی (م ۱۴۳۱ء) کی تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان، قاضی شہاب الدین دولت آبادی (م ۱۴۴۵ء) کی البحر المواج، خواجہ حسین ناگوری کی تفسیر نور النبی / نور الٰہی اور مدارک التنزیل از نسفی پر شیخ اللہ داد جون پوری (م ۱۵۱۸ء) کا حاشیہ وغیرہ لکھے گئے۔ (۱)

مغلیہ سلطنت میں عہد اکبری (۱۵۵۶ تا ۱۶۰۶ء) سے قبل زمخشری کی "الکشاف" رائج رہی، مگر اس دور میں انوار التنزیل (تفسیر بیضاوی) کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے بڑی تعداد میں حواشی لکھے گئے، اسے نصاب مدارس کا لازمی جز بنالیا گیا اور قرآن کریم کے ساتھ اسے بھی حفظ کیا جانے لگا۔ (۲)

اسی عہد میں قرآن فہمی سے شغف رکھنے والے علما کی ایک بڑی تعداد وجود میں آئی جن میں شیخ برہان کالپوری (م ۱۵۶۳ء)، ملا فیروز کشمیری (م ۱۵۶۵ء)، شیخ احمد فیاض انبیٹھوی (م ۱۵۷۴ء)، شیخ حمید سنبھلی (م ۱۵۷۵ء)، مفتی محمد جمال خان دہلوی (م ۱۵۷۶ء)، مولانا جلال تلہ لاہوری شیخ جمال گجراتی (م ۱۵۸۹ء)، ملک محمود پیارو گجراتی (م ۱۵۹۱ء)، شاہ فضل اللہ برہان پوری (م ۱۵۹۶ء)، سید عبداللہ المتقی السندی (م ۱۵۷۶ء)، شیخ عباسی السندی (م ۱۵۸۹ء)، نوح بن نعمت اللہ السندی (م ۱۰۸۹ء) شامل تھے۔

دربار اکبری سے وابستہ علمائے قرآن میں ملا عبداللہ سلطان پوری (م ۱۵۸۲ء)، حاجی ابراہیم سرہندی (م ۱۵۸۶ء)، حاجی ابراہیم محدث قادری (م ۱۵۹۳ء)، قاضی عبدالقادر (م ۱۶۰۲ء) اور قاضی بہلول سرفہرست ہیں۔ (۳)

صوفی علما میں شیخ عزیز اللہ چشتی اور شیخ ضیاء اللہ شطاری مشہور تھے، اس عہد میں تفسیر کی قدیم کتب کی شروح وحواشی اور قرآنی فنون پر عربی میں یہ کتابیں لکھی گئیں:

۱- تفسیر محمدی: شیخ حسن محمد بن احمد گجراتی (م ۱۵۷۴ء)، ۲- منبع عیون المعانی: شیخ مبارک بن خضر ناگوری (م ۱۵۹۳ء)، ۳- سواطع الالہام: ابوالفیض فیضی (م ۱۵۹۵ء)، ۴- درر التنظیم فی ترتیب الآی والسور: شیخ منور بن عبدالمجید (م ۱۶۰۲ء)، ۵- مطلب الطالبین الکریم: فارسی میں شیخ یعقوب صرفی کشمیری (م ۱۵۹۴ء)۔

مذکورہ تفاسیر کے علاوہ شیعی عالم فتح اللہ شیرازی (م ۱۵۸۸ء) یا فتح اللہ بن شکر اللہ کاشانی، عبدالرحیم خان کی بیٹی جانان بیگم کی طرف بھی کتب تفسیر منسوب ہیں۔

اسی عہد کی مزید چار عربی وفارسی جزوی تفاسیر اور تفسیر کی متداول کتب پر آٹھ حواشی کا ذکر بھی ملتا ہے۔

سترہویں صدی عیسوی میں جہانگیر، شاہ جہاں اور عالم گیر کے صد سالہ عہد حکومت کے

ہر دور میں تفاسیر، شروح، حواشی اور فن تفسیر پر کتب لکھنے کا کام جاری رہا، تاہم تفسیر اور قرآن کی نشر واشاعت کے حوالہ سے عالم گیر کا دور نمایاں ہے۔

اس عہد میں تفسیر قرآن کے رائج طریقہ سے مختلف فقہی اسالیب کی حامل اور قرآن سے مستنبط شرعی احکام پر مبنی تفاسیر لکھی گئیں، ان میں التفسیرات الاحمدیہ از ملا جیون (م ۱۷۱۷ء)، انوار الفرقان وازہار القرآن از شیخ غلام نقشبندی گھوسوی ثم لکھنوی (م ۱۷۱۴ء) اور ثواقب التنزیل از علی اصغر قنوجی (م ۱۷۲۸ء) نامکمل، جبکہ متصوفانہ افکار اور رنگ کی حامل تفسیر عرائس البیان کا فارسی ترجمہ از شیخ بدرالدین سرہندی تفسیر شاہ از شاہ محمد بن عبد محمد (۱۶۶۳ء) اور شیعی عقائد کی ترجمان تفسیر قرآن از علی شیرازی منظر عام پر آئیں۔

اس عہد کی دیگر اہم تفاسیر

۱-تفسیر مرتضوی: فارسی، شیخ زین العابدین شیرازی ۱۶۰۷ء میں نواب مرتضی حسن خان کے حکم سے مکمل ہوئی، ۲-تفسیر نظامی: فارسی، شیخ نظام الدین بن عبدالشکور تھانیسری (م ۱۵۳۷)، ۳-انوار الاسرار فی حقائق القرآن: عربی، از شاہ عیسی جنداللہ برہان پوری، ۴-تفسیر جہاں گیری ترجمہ قرآن: شیخ نعمت اللہ بن عطا نارنوتوی فیروز پوری (۱۶۶۲)، ۵-زبدۃ التفاسیر: عربی، خواجہ معین الدین کشمیری (م ۱۰۸۵ھ/ ۱۶۷۴ء)، ۶-شرح القرآن معینی: خواجہ معین الدین کشمیری (م ۱۰۸۵ھ/ ۱۶۷۴ء)، ۷-تفسیر امینی: فارسی، محمد امین صدیق علوی، ۸-زیب التفاسیر: فارسی، صفی بن ولی قزوینی کشمیری (م ۱۶۷۰)، ۹-زبدۃ التفاسیر: شیخ الاسلام بن قاضی عبدالوہاب (م ۱۶۹۷ء)، ۱۰-تفسیر شاہیہ: محمد محبوب عالم گجراتی (م ۱۷۰۰ء)، ۱۱-تفسیر القرآن: محمد محبوب عالم گجراتی (م ۱۷۰۰ء)، ۱۲-نعمت عظمی: فارسی، مرزا نورالدین (م ۱۷۰۹ء)۔

آیات وسور کی جزوی تفاسیر

۱-سورۃ الاخلاص: امیر ابو المعالی (م ۱۶۳۶ء)، ۲-سورۃ الجاثیہ: محمد ہاشم گیلانی (م ۱۶۵۰ء)، ۳-سورۃ یوسف: محمد بن ابی سعید کالپوری (م ۱۶۶۰ء)، ۴-سورۃ البقرہ: شیخ نورالدین احمد آبادی (م ۱۷۴۳ء)، ۵-آیۃ النور: شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۶۴۳ء)، ۶-تفسیر بعض الآیات: علی بن سید نور، ۷-تفسیر آیات بعض الاحکام: قاضی بیضاوی (م ۱۷۱۳ء)۔

حواشی وتعلیقات

اس صدی میں سب سے زیادہ حواشی وتعلیقات انوار التنزیل از قاضی بیضاوی (تفسیر بیضاوی) پر لکھی گئیں، جن کی تعداد دس ہے اور ان کے مصنفین میں ملا عبدالسلام لاہوری، مفتی عبدالسلام دیوی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، محمد ہاشم گیلانی، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، ملا محمد یعقوب لاہوری، میر طیب بلگرامی، سید عبداللہ دہلوی، نورالدین محمد صالح گجراتی اور سید جاراللہ الہ آبادی شامل ہیں۔

علوم القرآن

علوم قرآن کے حوالہ سے قرأت، کتابت، ناسخ منسوخ، اعراب، رسم الخط اور تخریج الآیات کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱-دستور المفسرین علم تفسیر: عمادالدین عارف (م ۱۶۱۲ء)، ۲-فتح محمد: فن تفسیر: صوفی شیخ عیسی بن قاسم سندھی، ۳-قرآنی الفاظ کا انڈکس: ہادیہ قطب شاہی، ۴-نجوم الفرقان: اشاریہ الفاظ قرآنی: مصطفی محمد بن سعید، ۵-مجمع الفوائد: متعلقات قرآن: محمد قلی بادشاہ قلی۔

۱۷۶۳ء میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کی تفسیری خدمات عظیم الشان ہیں، اس خاندان نے نہ صرف ترجمہ وتفسیر قرآن کے گراں قدر کارہائے نمایاں سرانجام دئے بلکہ اصول تفسیر میں "الفوز الکبیر" تصنیف کر کے تفسیری تقلید کے عرصہ دراز سے مروجہ انداز کو تبدیل کردیا، اسی کے تتبع میں سرسید احمد (م ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۷ء) نے بھی ایک کتاب لکھی اور اصول تفسیر میں جدت پیدا کی۔

اس عہد کے تراجم وتفاسیر

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جو تراجم وتفاسیر لکھے گئے، وہ درج ذیل ہیں:

۱-التفسیر النورانی للسبع المثانی: مولانا نورالدین احمد آبادی (م ۱۷۴۲ء)، ۲-نثر المرجان فی رسم قلم القرآن: شیخ محمد غوث بن ناصرالدین (م ۱۸۰۸ء)، ۳-التفسیر المظہری: قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۸۱۰ء)، ۴-حاشیہ الکمالین علی الجلالین: سلام اللہ رام پوری (م ۱۸۱۴ء)، ۵-تفسیر فتح العزیز: شاہ عبدالعزیز دہلوی (م ۱۸۲۴ء)، ۶-تفسیر آیۃ النور: شاہ رفیع الدین (م ۱۸۳۳ء)، ۷-ترجمہ قرآن: شاہ رفیع الدین (م ۱۸۳۳ء)، ۸-تفسیر معدن الجواہر: مولانا ولی اللہ فرنگی محلی (م ۱۸۴۳ء)۔

۱۸۵۷ء تا ۲۰۰۲ء کی تفاسیر اس عرصہ میں جو مکمل[1] تفاسیر لکھی گئیں وہ درج ذیل ہیں:

۱-حاشیہ بیضاوی وجلالین: مولانا فیض الحسن سہارن پوری (م ۱۳۰۴ھ)، ۲-تفسیر فتح البیان: نواب صدیق حسن خان (م ۱۳۰۷ھ)، ۳-تفسیر القرآن: سرسید احمد خان (م ۱۳۱۵ھ)، ۴-تفسیر حقانی: مولانا عبدالحق حقانی (م ۱۳۳۵ھ)، ۵-تفسیر مواہب الرحمٰن: سید امیر علی (م ۱۳۳۷ھ)، ۶-تفسیر احسن التفاسیر: سید احمد حسن دہلوی (م ۱۳۳۸ھ)، ۷-تفسیر وحدی[2]: مولانا وحید الدین فراہی (م ۱۳۳۸ھ)، ۸-مشکلات القرآن: علامہ سید انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۲ھ)، ۹-تفسیر بیان القرآن: مولانا اشرف علی تھانوی (م ۱۳۶۲ھ)، ۱۰-تفسیر المقام المحمود: مولانا عبید اللہ سندھی (م ۱۳۶۳ھ)، ۱۱-تفسیر ثنائی: مولانا ثناء اللہ امرت سری (م ۱۳۶۷ھ)، ۱۲-تفسیر عثمانی: مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۳۶۸ھ)، ۱۳-تبصیر الرحمٰن: مولانا ابراہیم سیالکوٹی (م ۱۳۷۵ھ)، ۱۴-ترجمان القرآن: مولانا ابوالکلام آزاد (م ۱۳۷۷ھ)، ۱۵-تفسیر القرآن: مولانا احمد علی لاہوری (م ۱۳۸۱ھ)، ۱۶-معارف القرآن: مفتی محمد شفیع (م ۱۳۹۶ھ)، ۱۷-معارف القرآن: مولانا محمد ادریس کاندھلوی (م ۱۳۹۴ھ)، ۱۸-تفسیر ماجدی: مولانا عبدالماجد دریا آبادی (م ۱۳۹۸ھ)، ۱۹-تفہیم القرآن: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (م ۱۹۷۹ء)، ۲۰-تدبر قرآن: مولانا امین احسن اصلاحی (۱۹۹۷ء)، ۲۱-الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن: غلام مصطفیٰ شاہ قاسمی، ۲۲-ضیاء القرآن: پیر محمد کرم شاہ الازہری (م ۱۹۹۹ء)، ۲۳-منہاج القرآن: پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری (۱۹۵۱ء)، ۲۴-تفسیر منہاج القرآن: ڈاکٹر برہان احمد فاروقی (م ۱۹۹۵ء)، ۲۵-انوار البیان فی کشف اسرار القرآن: مفتی عاشق الٰہی بلند شہری مہاجر مدنی (م ۲۰۰۱ء)، ۲۶-تفسیر درس قرآن:

---

[1] معارف: مگر اس فہرست میں بہت سی نامکمل تفسیروں اور متعدد ایسی کتابوں کے بھی نام دے گئے ہیں جو قرآنی علوم ومباحث پر مشتمل ہیں اور متعدد کتابوں کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے۔ [2] معلوم نہیں اس سے کون مراد ہے؟ مولانا حمید الدین فراہیؒ (م ۱۳۴۹ھ) کی تفسیر عربی میں ہے، اس کا نام تفسیر نظام القرآن وتاویل القرآن بالفرقان ہے، مولانا وحید الدین خاں مدیر الرسالہ بہ قید حیات ہیں، ان کی تفسیر کا نام تذکیر القرآن ہے، غالباً مقالہ نگار کی مراد مشہور مترجم حدیث وقار نواز جنگ مولانا وحید الزماں (م ۱۹۲۰ء) سے ہے۔ ''ض''

درس قرآن بورڈ، ۲۷-احسن التفاسیر: مولانا حافظ محمد حسن محدث (م ۱۹۹۹ء)، ۲۸-مطالعہ قرآن: مولانا محمد حنیف ندوی، ۲۹-تفسیر علم القرآن: سید قاسم محمود، ۳۰-تفسیر مطالب القرآن: مولانا غلام مصطفیٰ خان، ۳۱-تفسیر ہدایت القرآن: محمد عثمان کاشف الہاشمی، ۳۲-انوار القرآن: ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک (م ۲۰۰۲ء)۔

عربی تفاسیر اور ان کے موضوعات یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ محض قرآن اور صاحب قرآن علیہ السلام کی نسبت سے عربی زبان کو برصغیر میں درس وتدریس کے علاوہ تصنیفی وتالیفی زبان کا مقام بھی ملا اور عربی زبان میں دیگر علوم وفنون کی طرح ترجیحاً تفسیر قرآنی کا گراں قدر اور وسیع ذخیرۂ علمی تیار ہوا، عربی تفاسیر مختلف موضوعات پر لکھی گئیں ہیں، مثلاً:

تصوف: ۱-کاشف الحقائق: محمد بن احمد شریحی، ۲-درر ملتقط: سید گیسودراز (م ۱۴۲۲ء)، ۳-منبع عیون المعانی: مبارک بن خضر ناگوری (م ۱۰۰۱ء)، ۴-الروضۃ الخضر الاہل العشق و الصفا: حافظ محمد احسن پشاوری (م ۱۲۶۳ھ)، تحقیق ڈاکٹر حافظ عبد الرحیم۔

اختصار بہ انداز جلالین: ۱-قران القرآن بالبیان: کلیم اللہ جہاں آبادی (م ۱۱۴۱ھ)، ۲-زبدۃ التفاسیر: خواجہ معین الدین کشمیری (م ۱۰۸۵ھ)، ۳-تفسیر صغیر: امیر عبداللہ قنوجی (م ۱۱۷۸ھ)، ۴-السلسبیل فی التنزیل: مولانا عبدالعزیز پرہاروی (م ۱۲۳۹ھ) تحقیق ڈاکٹر محمد شفقت اللہ خان (۴)، ۵-تفسیر القرآن بتبصیر الرحمٰن وتفسیر المنان: علامہ علی مہائمی (م ۸۳۵ھ)۔

ربط آیات: تفسیر محمدی: حسن بن محمد میاں جیو (م ۹۸۲)، یہ تفسیر ربط کے حوالہ سے منفرد ہے۔

منقبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: تفسیر القرآن: حاجی عبدالوہاب بخاری (م ۹۳۲ھ)۔

اس میں مفسر نے قرآن کریم کی تمام آیات کے مطالب اس طرح پیش کیے ہیں کہ گویا سارا کلام ربانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ہے، افسوس کہ اس کا کوئی نسخہ دست یاب نہیں ہے۔

بے نقط (غیر منقوط): سواطع الالہام: ابوالفیض فیضی (م ۱۰۰۴ء)، یہ کتاب ۷۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ (۵)

قدیم تفاسیر کے خلاصے (قدیم وجدید کا امتزاج) ۱-فتح البیان فی مقاصد القرآن: نواب صدیق حسن خاں قنوجی (م ۱۳۰۷ھ)، ۲-تفسیر القرآن بالقرآن: تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن:

مولانا ثناء اللہ امرت سری (م ۱۳۹۷ھ)۔

فقہ حنفی کی حامل تفسیر: ۱-التفسیر المظہری: قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ)

خلاصہ تفسیر: ۱-زبدۃ التفاسیر: خواجہ معین کشمیری (م ۱۰۸۵ھ)، ۲-زبدۃ التفاسیر للقدماء المشاہیر: قاضی عبدالوہاب گجراتی (م ۱۱۰۹ھ)، ۳-قران القرآن بالبیان: سلیم اللہ جہان آبادی (م ۱۱۴۱ھ)۔

جزوی تفاسیر: سورہ یوسف، سورہ المرسلات، سورہ العصر سورہ الکافرون۔

آیات: آیۃ النور، مشکل آیات، تفسیر غرائب القرآن، بعض پاروں بالخصوص پارہ عم کی ۴ صفحات سے لے کر ۸ صفحات کی تفسیر۔

حواشی، تعلیقات وشروح: ۱-حاشیہ بیضاوی وجلالین: مولانا فیض الحسن سہارن پوری (م ۱۳۰۴ھ)، ۲-مدارک التنزیل از نسفی، ۳-انوار التنزیل از بیضاوی جلالین اور ان کے علاوہ الاکلیل از سیوطی الکشاف از زمخشری کے حواشی بھی لکھے گئے ہیں۔

فارسی تراجم وتفاسیر فارسی برصغیر میں طویل عرصہ تک سرکاری اور علمی زبان رہی، ایران اور افغانستان کے قریب اور وسط ایشیائی ریاستوں سے اتصال کے باعث یہاں اس کا اثر ونفوذ گہرا رہا، ۷۳۰ھ میں حسن بن محمد علقمی المعروف بہ نظام نیشاپوری دولت آبادی کا ترجمہ عربی تفسیر غرائب القرآن کے ساتھ شامل ہے، یہ ترجمہ برصغیر میں پہلا فارسی ترجمۂ قرآن کہلاتا ہے، جب کہ محمد بن احمد المعروف خواجگی شیرازی کے طبرسی کی تفسیر ''مجمع البیان'' کے خلاصہ کو اولین فارسی تفسیر کا درجہ حاصل ہے۔(۶)

ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں کہ برصغیر کے فارسی تراجم وتفاسیر قرآن کی تعداد دو سو پچاس سے زائد ہے، جب کہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق صرف فارسی تراجم قرآن کی تعداد ۵۲ اور کلی وجزوی تفاسیر ۳۰ سے زائد ہیں۔(۷)

فارسی کی اہم تفاسیر ۱-البحر المواج: قاضی شہاب الدین دولت آبادی (م ۸۴۹ھ)، ۲-تفسیر اکبری: مبارک ناگوری (م ۱۰۰۱ھ)، ۳-مطلب الطالبین: یعقوب صرفی کشمیری (م ۱۰۰۳ھ)، ۴-نعمت عظمیٰ: نورالدین محمد معروف بہ نعمت اللہ ولی (م ۱۰۱۵ھ)، ۵-شرح القرآن

معینی: خواجہ معین کشمیری (م ۱۰۸۵ھ)، ۶-زیب تفسیر: محمد صفی بن ولی قزوینی (م ۱۰۸۷ھ)، ۷-زیب التفاسیر: عالم گیر کی صاحب زادی زیب النساء (م ۱۱۱۲ھ)، ۸-تفسیر امینی: محمد امین صدیقی۔

ان تفاسیر میں البحر المواج نہ صرف مشکل ہے بلکہ نحوی تراکیب، فقہی مسائل اور عقائد پر مشتمل ہے، ایک اور اہم فارسی تفسیر دور جدید میں سید ابوالقاسم رضوی کشمیری لاہوری (۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۹ء) کی ''لوامع التنزیل وسواطع التاویل'' ہے، یہ تفسیر انتہائی مبسوط اور ۳۰ ضخیم جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے، اس کے ابتدائی ۱۵ حصے مولانا ابوالقاسم رضوی نے لکھے، ان کی وفات کے بعد بقیہ ۱۵ جلدیں ان کے صاحب زادے مولانا سید علی الحائز (م ۱۳۶۰ھ) نے تحریر کی، اس میں مختلف شیعی وسنی مفسرین کے اقوال، مباحث ومناظرات کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔

عربی تفاسیر کے فارسی تراجم ۱-تفسیر الطبری کا فارسی ترجمہ منصور بن نوح سامانی کے عہد ۳۵۲ھ/ ۹۶۳ء میں سات علما کے بورڈ نے کیا، ۲-امام رازی کی تفسیر کبیر کا ترجمہ ۱۰۸۱ھ میں مولانا صفی الدین دیبلی نے کیا۔

اہم فارسی تراجم قرآن نظام نیشاپوری، مخدوم جہانیاں، جہاں گشت، نوح معالائی سندھی، شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ محمد غوث لاہوری، شاہ محمد اجمل کے فارسی تراجم مشہور واہم ہیں۔

قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے عربی زبان، اس کی صحیح فہم وادراک کے لیے تو اہل عرب تک لغات کے محتاج ہیں، چہ جائیکہ اہل عجم، ان کے لیے تو اس کی ضرورت اور شدید ترین ہو جاتی ہے، برصغیر کے علما اس ضرورت اور فرض سے کبھی غافل نہیں رہے (۸)، لغات القرآن کے موضوع پر برصغیر میں لکھی گئی تصانیف کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہاں پر مختلف زبانوں میں اس موضوع پر بہت سی تصانیف نظر آئیں گی۔

لغات القرآن کی عربی تصانیف یہاں پر پہلے لغات القرآن کی ان کتابوں کا تذکرہ کیا جائے گا جو عربی زبان میں تصنیف کی گئی ہیں:

۱-مفردات: شیخ محمد مراد بخاری کشمیری نے ۱۱۳۱ھ میں لکھی۔(۹)

۲-لغات القرآن: مولانا حماد اللہ ہالیجوری (م ۱۹۶۲ء)، اس میں مفرد الفاظ عربی

میں ابجد کی ترتیب سے لکھے گئے ہیں، یہ ایک مکمل کتاب ہے، مولانا محمد یوسف بنوری نے اس پر ایک شان دار مقدمہ بھی لکھا ہے۔ (۱۰)

۳-العرفان بمفردات القرآن: مولانا محمد اسمٰعیل عودوی (م ۱۹۷۰ء)، یہ لغت کے انداز میں ایک طرح کی تفسیر قرآن بھی ہے۔

۴-لغات القرآن: مولانا محمد اجمل ہزاروی، ولادت ۱۹۳۲ء، یہ ابھی نامکمل ہے۔

۵-ترغیب الاخوان فی ترکیب القرآن: مولانا منظور احمد نعمانی (۱۹۵۰ء)، یہ کتاب مبتدی بچوں کے لیے درسی طرز پر لکھی گئی ہے، کتاب کے شروع میں مبادی ترکیب کا بیان ہے، (اصول ترکیب) دوسرے حصہ میں ترکیب القرآن ولغات القرآن ہیں، (۱۴۱۱ھ) میں مکمل ہوئی۔

۶-الفروق: مولانا ضمیر احمد قدسی (م ۱۹۶۲ء)، اس میں قرآن وحدیث کے ان الفاظ کے معنی بیان کئے گئے ہیں جو الفاظ کے لحاظ سے متفق اور متحد ہیں لیکن ان کے معنی مختلف ہیں، غیر مطبوعہ۔

۷-قاموس الفاظ القرآن الکریم: دکتور عبد اللہ عباس ندوی، یہ کتاب عربی اور انگریزی میں ہے، اس میں مصنف نے الفاظ قرآن کے معنی سیاق اور اشتقاقی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے بیان کیا ہے، یہ کتاب درحقیقت مستشرق جون پیٹرس کی کتاب کی غلطیوں کی اصلاح ہے۔

۸-کتاب مفردات القرآن: مولانا حمید الدین فراہی (م ۱۹۳۰ء)، اس میں اہم قرآنی الفاظ کے معانی تحریر کئے گئے ہیں، مصنف نے ۷۷ ایسے الفاظ کو لیا ہے جن کی تشریح عام طور سے علما نے نہیں کی ہے (۱۱)، یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں پہلی بار طبع ہوئی تھی، اب ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی نے تحشیہ کے بعد دوبارہ شائع کی ہے۔

اللباب فی تاویل الالفاظ التی کثرت فی الکتاب: سراج الاسلام حنیف، مردان پشاور، اس میں مصنف نے قرآن کریم کے ان الفاظ کو یکجا کردیا ہے جو قرآن کریم میں مختلف مقامات پر مختلف معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔

۹-فوائد القرآن المعروف باصطلاحات القرآن: مولانا عبد اللہ بہلوی (م ۱۹۷۸ء)۔

لغات القرآن پر دیگر زبانوں میں تصانیف

عربی کے علاوہ اور بھی کئی زبانوں میں ہندوستانی علما نے لغات القرآن پر کتابیں لکھی ہیں جیسے:

سندھی: الیاقوت والمرجان فی شرح غریب القرآن: حماد اللہ ہالیجوری، اس میں قرآن کریم کی سورۂ اعراف سے سورۂ ناس تک کے مشکل الفاظ کے معنی سندھی زبان میں بیان کئے گئے ہیں، یہ کتاب سورتوں کی ترتیب سے لکھی گئی ہے، یعنی ہر سورت کے الفاظ معنی لغت کے انداز میں سورت کا نام دے کر اس کے تحت بیان کئے گئے ہیں۔

لغات القرآن: مولانا خیر محمد ندوی: یہ بھی سندھی زبان میں لکھی گئی ہے، البتہ اس میں بلوچی اور اردو میں بھی معنی لکھے گئے ہیں۔

انگریزی: VOCABULARY OF THE HOLY QORAN: عبد اللہ عباس ندوی، یہ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ترتیب دی گئی ایک اچھی کتاب ہے۔

لغات القرآن (انگریزی): مولانا عبد الکریم پاریکھ ناگپور، مستند تراجم کو سامنے رکھ کر یہ لغت تیار کی گئی، افعال کے سامنے حروف اصلی یعنی مادہ بھی دیا گیا ہے، کتاب کے شروع میں نحو وصرف کے کچھ ضروری قواعد بھی درج کردیئے گئے ہیں۔

ہندی: ہندی زبان میں لکھی گئی یہ کتاب لغات القرآن (ہندی) بھی مولانا عبد الکریم پاریکھ کی ہے۔

اردو زبان: اس موضوع پر اردو میں لکھنے کی ابتدا حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۲۶ھ) کے لائق فرزند شاہ عبد القادر نے کی، انہوں نے جب اردوے معلّی کے آئینہ خانہ میں قرآن حکیم کے لعل وجواہر سجائے اور پہلا بامحاورہ اردو ترجمہ قرآن تحریر کیا تو لغات القرآن کے موضوع پر بھی ایک مختصر کتاب مرتب کی، جس میں الفاظ کے معنی اور مختصر تشریح درج کی گئی، منشی ممتاز علی میرٹھی نے مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۲۹۸ھ میں شاہ عبد القادر کا ترجمہ شائع کیا، اس کے حاشیہ پر یہ لغات القرآن بھی شائع کی۔ (۱۲)

عجائب البیان فی لغات القرآن مع تفسیر المنان ونجوم الفرقان: مولانا محمد عبد اللہ المعروف بہ جیون بن نور الدین پھلوی (م ۱۹۴۷ء)، یہ اردو زبان میں لکھی گئی ایک اچھی لغت

ہے جس میں قرآن کریم کے الفاظ کے معنی آسان اور سہل انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

جنۃ النعیم فی استخراج لغات القرآن الکریم: مولوی اسد اللہ سندھی (م ۱۸۶۹ء)، یہ بھی ایک نہایت اچھی کتاب ہے۔

دینی لغات: مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی (م ۱۹۱۳ء)، یہ قرآن وحدیث وفقہ کی جامع اردو لغت ہے، ستمبر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔

تدریس القرآن: مولانا محمد اجمل ہزاروی (۱۹۳۲ء)، اس میں قرآن مجید کے مفرد الفاظ کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

لغات القرآن: مولانا خیر محمد ندوی، یہ کتاب اردو، بلوچی اور سندھی زبان میں لکھی گئی ہے۔

قاموس القرآن: مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (۱۹۰۹ء)، یہ لغات القرآن میں لکھی گئی کتابوں میں ایک عمدہ اضافہ ہے، اس سے ایک عام آدمی بھی آسانی سے استفادہ کرسکتا ہے۔

ترجمہ قرآن: مولانا محمد آصف قاسمی، اس میں مولانا نے قرآن کریم میں بار بار تکرار کے ساتھ آنے والے الفاظ یعنی مکررات کو چھوڑ کر صرف اصلی الفاظ معنی کے ساتھ یکجا کردیئے ہیں۔

تدریس لغۃ القرآن: ابو مسعود حسن علوی، اس میں مصنف نے قرآنی آیات لکھ کر ہر جملہ اور الفاظ کو الگ الگ کر کے علاحدہ علاحدہ خانوں میں ترجمہ کیا ہے، پھر بامحاورہ ترجمہ ہے، عربی گرامر مع ترکیب بھی بیان کی ہے، اس کے بعد لغوی وتفسیری شرح بھی کی ہے، لغت میں ہر لفظ کا مصدر، معنی اور مترادفات کو بھی بیان کیا ہے، آیت اور جملہ کی ترکیب پر روشنی ڈالی ہے، قواعد بھی بیان کئے گئے ہیں، افعال کے ساتھ ماضی، مضارع اور مصادر بھی دیئے گئے، اسما اور اماکن پر بھی تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔ (۱۳)

لسان القرآن: مولانا محمد حنیف ندوی، یہ قرآن کی جامع تفسیری اور توضیحی لغت ہے، اس کے شروع میں ایک عمدہ مقدمہ بھی ہے، جس میں قرآن فہمی کے اصول اور تقاضے بیان کئے ہیں۔ (۱۴)

لغات القرآن: مولانا عبد الرشید نعمانی، مولانا عبد الدائم جلالی، یہ قرآن کریم کی ایک

بلند پایہ لغت ہے، اردو زبان میں اس سے بہتر لغت دست یاب نہیں، اس میں الفاظ کی فہرست کا فائدہ ضمناً حاصل ہوتا ہے، کیوں کہ اسے مادہ ماخذ سے ہٹ کر الفاظ کی موجود ومشتق شکلوں کی ترتیب پر مرتب کیا گیا ہے، یعنی ہر لفظ اور کلمہ بغیر مادہ معلوم کئے آسانی کے ساتھ تلاش کیا جاسکتا ہے، اس کو ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا تھا۔

مترادفات القرآن مع الفروق اللغویہ: یہ مصنف کی طویل مدت کی ذاتی محنت لگن اور جستجو کا نتیجہ ہے کہ اردو زبان میں ایک ایسی عمدہ کتاب وجود میں آگئی جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے قطعی منفرد اور قرآن فہمی کے لئے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ مصنف نے اس میں قرآن کریم کے تقریباً تمام مترادف الفاظ کو بڑے عمدہ سلیقہ سے جمع کردیا ہے جیسے قیامت کے مترادفات الساعۃ، یوم الدین، یوم الخروج، یوم الحساب، یوم الفصل، غاشیہ، قارعہ، حاقہ، آزفہ، طامۃ الکبری، الصاخہ، یوم الآخرۃ وغیرہ۔

شرح الفاظ القرآن: مولانا عبد الرشید گجراتی، یہ قرآن کریم کے الفاظ کے معنی وشرح پر ایک اچھی لغت ہے۔

معجم القرآن: سید فضل الرحمن۔ غریب القرآن: مرزا ابو الفضل بن فیاض علی۔

المفردات فی غریب القرآن: حافظ نور الحسن۔ مرآۃ القرآن: حافظ عبد الحئی۔

معجم القرآن: ڈاکٹر غلام جیلانی برق۔ لغات القرآن: تاج الدین دہلوی (۱۹۵۰ء)، کراچی۔

قرآن مجید کا عربی اردو لغت: ڈاکٹر محمد میاں صدیقی، یہ لغت ڈاکٹر محمد میاں صدیقی کی ایک نہایت ہی گراں قدر تالیف ہے، اس کے بارے میں مصنف خود رقم طراز ہیں:

"یہ کتاب ان حضرات کے لیے مرتب کی گئی ہے جو عربی پر دسترس نہیں رکھتے اور ہر لفظ کے مادہ کو تلاش کرنا ان کے لیے دشواری کا سبب بن سکتا ہے، اس لیے مادہ کے بجائے الفاظ قرآن کو اپنی ہی صورت میں لغت تصور کر کے حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کردیا گیا ہے، جیسے: اسقینٰکم ہم نے تم پلایا، اس لفظ کو الف، سین میں شمار کیا گیا ہے حالاں کہ اس کا مادہ سقی ہے اور اس اعتبار سے اس لفظ کو سین، قاف میں آنا چاہئے تھا"۔ (۱۵)

ان کے علاوہ برصغیر کے بعض علما اور محققین نے قرآن کریم کے لغت کے انداز میں ترجمے کیے جیسے ہر ہر لفظ کو الگ الگ خانہ میں لکھ کر نیچے اس کا ترجمہ دیا گیا ہے، تاکہ عام قاری اور مبتدی کے لئے ترجمہ قرآن کا سیکھنا آسان ہو، ان تراجم میں شاہ رفیع الدین محدث دہلوی، خواجہ حسن نظامی، ڈپٹی نذیر احمد اور جناب حافظ نذر احمد کے تراجم زیادہ مشہور اور قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ اور بھی کئی حضرات نے اسی طرح لغوی طرز پر ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

بعض مفسرین نے اپنی اپنی تفاسیر میں مشکل مفردات کے معنی لغات کے انداز میں بیان کیے ہیں اور مشکل الفاظ کے نہ صرف معنی بتائے بلکہ ان پر تشریحی وتوضیحی نوٹ بھی تحریر کئے، تاکہ تفسیر کے کسی بھی قاری کو فہم قرآن وتفسیر میں کوئی دقت نہ ہو۔

ان تفاسیر میں بیان القرآن: مولانا اشرف علی تھانوی۔

ضیاء القرآن: پیر محمد کرم شاہ الازہری۔

مجموعہ تفسیر فراہی: علامہ حمید الدین فراہی۔

تدبر قرآن: علامہ مولانا امین احسن اصلاحی قابل ذکر ہیں۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ برصغیر کے اہل علم نے دیگر اسلامی علوم سے قطع نظر لغات القرآن کے موضوع پر جتنا کام کیا ہے، وہ بلاشبہ مسلمانان برصغیر کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔

علوم القرآن اور تاریخ واصول تفسیر پر کتب ومقالات

منشور قرآن: (مضامین قرآن کا سہ لسانی اشاریہ) عبدالحکیم ملک۔

تفسیر منسوخ القرآن: علامہ رحمت اللہ طارق۔

مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی: مولانا ابوالحسن علی ندوی۔

حدائق القرآن فی معارف القرآن: مولانا محمد عبدالغفور فاروقی، اس میں علوم القرآن کو ۳۰ حدائق یعنی ۳۰ باغیچوں میں ذکر کیا گیا ہے۔

الناسخ والمنسوخ: مولوی سخاوت علی جون پوری۔

البیان فی علوم القرآن: مولوی عبدالحق بن محمد میر دہلوی۔

اعجاز البیان فی لغات القرآن: حافظ روح اللہ اٹاوی۔

تاریخ القرآن: مولوی اسلم بن سلامت اللہ جیراج پوری۔

ارض القرآن: سید سلیمان ندوی۔

التحریر فی اصول التفسیر: سر سید احمد خان دہلوی۔

اقتباس الانوار: مولوی عبید اللہ پاٹلی۔

اصول تفسیر وتاریخ تفسیر: پروفیسر منظور احمد میاں (م ۲۰۰۲ء)۔

تاریخ تفسیر ومفسرین: علامہ غلام احمد حریری۔

مضامین قرآن: میر محمد حسین۔

مقدمۃ الفرقان مع توضیح ام القرآن: مولانا عبداللہ درخواستی (م ۱۹۹۴ء)۔

مناہل العرفان: مولانا محمد مالک کاندھلوی۔

اردو تفاسیر (کتابیات): سید جمیل نقوی۔

قرآن کے اردو تراجم (کتابیات): ڈاکٹر احمد جان۔

تاریخ قرآن: عبدالصمد صارم۔

قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر: ڈاکٹر سید حمید شطاری۔

قرآن حکیم کے اردو تراجم: ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین۔

ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں: ڈاکٹر سالم قدوائی۔

مولانا ثناء اللہ امرت سری کی تفسیری خدمات، تحلیلی وتنقیدی جائزہ: محمد اسحاق اظہر، لاہور، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور۔

چودہویں صدی ہجری میں اردو زبان کے تفسیری ادب پر مقامی سیاسی اثرات: مسز نصرت ضیاء، مقالہ برائے ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

تذکرۃ المفسرین: قاضی زاہد الحسینی اٹک۔

نیل السائرین فی طبقات المفسرین: شیخ پیری، طاہر مولانا مردان۔

اعجاز القرآن: علامہ عتیق فکری۔

علوم القرآن: مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی۔

علوم القرآن: مولانا شمس الحق افغانی۔

اردو تفاسیر کی خصوصیات ۱- حجم اور مواد کے اعتبار سے گراں قدر، ۲- تفاسیر کی غرض و غایت عام فہم انداز میں قرآن کے مقصد و منشا کی تشریح، ۳- جدید ذہن کا اطمینان، ۴- عصر حاضر کے مسائل اور ضروریات کی نشان دہی اور حل کی کوشش، ۵- ترجمہ کی بجائے فہم قرآن کی طرف توجہ۔

علاقائی زبانوں میں تفاسیر پشتو: برصغیر میں سرحد کو زمانہ قدیم سے خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے، یہاں طویل عرصہ تک فارسی رائج رہی، اہل سرحد کی قبائلی کشمکش اور خانہ جنگیوں کے علاوہ بیرونی حملہ آوروں سے برسرپیکار رہنے کے باعث جہاں تصنیف وتالیف کی طرف توجہ کم رہی وہاں موجود علمی ذخائر بھی محفوظ نہ رہ سکے، طویل عرصہ تک فارسی تفاسیر وتراجم بالخصوص "تفسیر حسینی" کے تداول کے باعث پشتو تراجم وتفاسیر کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی، اس پر مستزاد اہل بنگال کی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر ترجمہ قرآن کو انیسویں صدی کے وسط تک نہ صرف معیوب سمجھا جاتا رہا بلکہ ایسی کوشش کو تحریف قرآن قرار دیا جاتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ پختون عوام مزاجاً تحریر کی بجائے تقریر اور وعظ کے خوگر اور دل دادہ تھے، لہٰذا قرآنیات کے مختلف فنون میں تصنیف و تالیف نہ ہوسکی، ایک اور چیز یہ بھی مانع رہی کہ برصغیر کی دیگر زبانوں کے برعکس پشتو کا اپنا کوئی رسم الخط بھی موجود نہ تھا۔

انیسویں صدی کے وسط میں سیاسی وتہذیبی استحکام کے ساتھ فارسی زبان کے اثرات زائل ہونا شروع ہوئے اور اہل سرحد کے روابط برصغیر کے دیگر علاقوں سے استوار اور آمد ورفت کا سلسلہ جاری ہوا تو یہاں نئے حالات کے تقاضوں کا احساس کیا جانے لگا اور پشتو تراجم وتفاسیر کی ضرورت پیدا ہوئی، پہلا پشتو ترجمہ قرآن ۱۷۶۱ء میں مولانا رکن الدین نے کیا۔ (۱۶)

پشتو تراجم وتفاسیر کے آغاز سے اب تک تقریباً ۱۸ تراجم اور متعدد مکمل وجزئی تفاسیر کے تذکرے موجود ہیں، ان میں چار منظوم تراجم ہیں جن میں سے تین مکمل اور ایک جزوی ہے۔

اردو تفاسیر کے پشتو تراجم: پشتو میں زیادہ تر اردو تفاسیر کے تراجم پائے جاتے ہیں جن میں

چند یہ ہیں:

۱- تفسیر حسینی: کا ترجمہ عبداللہ کاکاخیل (۱۸۳۶-۱۹۱۷ء)۔

۲- المنار کا ترجمہ بنام تفسیر حبیبی/مبین: مولانا حبیب الرحمن۔

۳- تفہیم القرآن کا ترجمہ پروفیسر مولانا فضل معبود، مولانا رحیم گل۔

۴- معارف القرآن: از مولانا مفتی محمد شفیع کا ترجمہ: ڈاکٹر قاضی مبارک۔

پشتو تفاسیر: ۱- تفسیر یسیر: مولانا مراد علی، یہ پہلی اور مقبول، مستند اور ضخیم تفسیر ۱۲۸۴ھ میں لکھی گئی، بعدازاں اس کے حواشی "تیسیر الیسیر" اور "فوق الیسیر" کے نام سے لکھے گئے۔

۲- مخزن التفاسیر: مولانا محمد الیاس پشاوری کو چیانی، تفسیر ۱۳۱۳ھ میں دہلی سے شائع ہوئی مگر مقبول نہ ہوسکی۔

۳- تفسیر حسنی: تفسیر حسنی (فارسی) کا ترجمہ، مولانا عبداللہ وعبدالعزیز عادل گڑھی نے کیا اور ۱۹۳۰ء میں بمبئی سے شائع ہوئی۔

۴- تفسیر ودودی: یہ تفسیر قیام پاکستان کے بعد لکھی گئی، اس کے مفسر مولانا فضل ودود اسے پندرہ سترہ پاروں تک مکمل کرسکے، بعدازاں ان کے شاگرد مولانا گل رحیم نے اسے مکمل کیا، یہ تفسیر پشتو کی ترقی یافتہ نثر کا عمدہ نمونہ ہے۔

پشتو میں جزوی تفاسیر: قطب المنسکر فی تفسیر سورۃ الکوثر: تفسیر سورہ کوثر ابن تیمیہ کا منظوم پشتو ترجمہ، تفسیر والضحیٰ، تفسیر بے نظیر (پارہ ۳۰-۲۹) اور تفسیر الظاہر (پارہ اول): مولانا عبدالودود سرحدی، تفسیر اکوڑہ خٹک (پارہ اول)، مولانا بادشاہ گل، پارہ عم، مولانا محمد پشاوری (م۱۸۸۳ء) (پہلا مطبوعہ ترجمہ) ترجمہ سورۂ اخلاص: مولانا غلام ربانی لودھی ہزاروی (۱۸۹۹-۱۹۷۴م) ترجمہ وتفسیر سورہ آل عمران والبقرہ: مولانا فضل الرحمن پشاوری (م ۱۹۰۱) پارہ اول: مولانا عبدالشکور طوروی۔

یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ صوبہ سرحد میں قرآن کریم کے تراجم وتفاسیر کے مطالعہ میں مردوں سے کہیں زیادہ خواتین نے دل چسپی لی، ان مفسرین کے علاوہ سرحد کے بعض ایسے قدیم وجدید مفسرین کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے اردو یا عربی میں مکمل اور جزوی تراجم وتفاسیر اور متعلقات قرآن پر تصانیف تحریر کیں، ان میں قابل ذکر مولانا عزیز گل کاکاخیل کی انگلستان کے

شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی اہلیہ کا انگریزی ترجمہ قرآن ہے جو دونوں میاں بیوی کے ۳۰ سالہ مطالعہ قرآن کا حاصل بھی ہے۔

مجموعی طور پر سرحد کے ۵۰ سے زائد مفسرین ومترجمین کا ذکر مختلف تذکروں میں موجود ہے، جنہوں نے قرآن کے حوالہ سے تقریباً ۷۵ تصانیف تحریر کیں۔

سندھی تفاسیر معروف جرمن محقق این میری شمل کے مطابق ۲۷ تراجم وتفاسیر سندھی میں لکھی گئیں، اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اسی قدر تعداد مذکور ہے۔ (۱۷)

۱- سندھی نثر میں پہلی تفسیر مولانا ابوالحسن ٹھٹھوی نے بارہویں صدی ہجری کے وسط میں لکھی۔

۲- مفتاح رشد اللہ: سندھ کی یہ قدیم تفسیر ہے، جسے قاری فتح محمد قطامانی نے پیر صاحب جھنڈو شریف مولانا رشید الدین کی فرمائش پر تیرہویں صدی ہجری میں تحریر کی۔

۳- تفسیر کوثر: پیر مردان علی شاہ، پیر پگاڑو کی پانچ جلدوں میں مکمل تفسیر قرآن۔

۴- تنویر الایمان: ٹولوی عثمان نورنگ زادہ نے چار جلدوں میں یہ تفسیر لکھی جو عوام میں بہت مقبول ہوئی۔

سندھی جزوی تفاسیر: تفسیر ہاشمی، آخری دو پاروں کی تفسیر از مخدوم محمد ہاشم بن عبدالغفور ٹھٹھوی (م ۱۱۷۴ھ) ان ہی محمد ہاشم ٹھٹھوی سے عربی میں ایک کتاب جنۃ النعیم فی فضائل القرآن الکریم منسوب ہے، جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اردو تفسیر کا سندھی ترجمہ مولانا جان محمد بھٹو مرحوم نے ''تفہیم القرآن'' کے سندھی ترجمہ کا آغاز کیا جسے ۱۹۹۵ء میں مولانا امیر الدین نے چھ جلدوں میں مکمل کر کے شائع کیا۔

پنجابی تفاسیر پنجاب ہمیشہ سے علم وعرفان کا مرکز رہا ہے، یہاں ۱۰۹۰ھ میں نواب جعفر خان کی فرمائش پر حافظ برخوردار نے سورہ یوسف کی منظوم تفسیر احسن القصص لکھ کر تراجم وتفاسیر کی بنیاد ڈالی، ان کے بعد ۶۴ تراجم وتفاسیر لکھے گئے جن کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

۱- پنجابی زبان کا اپنا کوئی تحریری خط نہیں، لہذا تمام تفاسیر وتراجم گورمکھی یا فارسی رسم الخط میں لکھی ہوئی ہیں۔

۲- اکثر وبیشتر تراجم وتفاسیر منظوم ہیں جنہیں دیگر پنجابی داستانوں کی طرح لکھا گیا

اور وہی مقبول ہوئے۔

۳- بعض تراجم اردو میں کیے گئے جن کے ساتھ تفسیر منظوم پنجابی میں کی گئی، اسی طرح اس کے برعکس یعنی تراجم پنجابی اور تفاسیر اردو منظوم۔

مکمل پنجابی تفاسیر کی تعداد ۴ ہے جو درج ذیل ہیں:

۱- تفسیر نبوی: نبی بخش حلوائی، اردو منثور ترجمہ اور پنجابی منظوم تفسیر۔

۲- تفسیر محمدی: محمد بن بارک اللہ کی پنجابی نثر میں ترجمہ اور منظوم تفسیر۔

۳- تفسیر فیروزی: فیروز الدین، منظوم پنجابی ترجمہ مع اردو ترجمہ۔

۴- تفسیر یسیر: عبدالغفور جالندھری، منظوم پنجابی ترجمہ شاہ رفیع الدین مع مختصر اردو تفسیر۔

جزوی تفاسیر بھی پنجابی زبان میں لکھی گئیں، اس سلسلے میں سب سے زیادہ سورہ یوسف کی تفاسیر وتراجم کیے گئے جن کی تعداد ایک اندازے کے مطابق تقریباً ۱۳ ہے، یہ سب منظوم پنجابی میں ہیں جنہیں قصہ ہیر رانجھا، قصہ سیف الملوک کی طرح دیہی عوام میں قصہ یوسف زلیخا کے نام سے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔

ان تراجم وتفاسیر میں گلزار یوسفی: فیروز الدین ڈسکوی (۱۳۲۰ھ)، قصص الحسنین: مولوی عبدالستار (۱۳۲۰ھ)، گلزار یوسف: مولوی محمد دل پذیر (۱۲۸۷ھ)، احسن القصص: عبدالحکیم بہاول پوری (۱۲۱۸ھ)، تفسیر یوسف: مولوی احمد یار گجراتی، احسن القصص: مولوی غلام رسول عالم پور کوٹلوی (۱۲۹۰ھ)، تفسیر حامد: حامد شاہ عباسی، یوسف زلیخا: مولوی چراغ الدین جونیکے والے (۱۹۸۵ء)، تفسیر سورہ یوسف: محمد اظہر حنفی بھیروی اور عبدالرحمٰن ہر دو حافظ برخوردار ہیں جن میں سے اکثر دست یاب ہیں، ایک اور تفسیر سورہ یوسف کا پتہ بھی چلتا ہے جسے غلام مصطفی نے لکھا اور ۱۸۸۵ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔

کشمیری تفاسیر کشمیر میں سلطان شہاب الدین کے عہد حکومت (۱۳۵۴ء، ۱۳۷۳ء) میں پہلی تفسیر شاہ ہمدان نے عربی میں لکھی، بعد ازاں فارسی وعربی کی متعدد تفاسیر منظر عام پر آئیں جن میں شیخ یعقوب صرفی (فارسی)، خواجہ معین الدین (فارسی، عربی)، صفی الدین کشمیری (فارسی)، بابائے داؤد خاکی (عربی)، ملا عبدالرشید کشمیری (عربی)، علامہ تفضل حسین (فارسی) اور مولانا معین الدین (عربی) ہیں۔

۱- قرآن کریم کا پہلا کشمیری ترجمہ ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر حمید اللہ کی تحریک پر مولانا محمد احمد مقبول سبحانی نے کیا جو ۱۹۵۰ء میں طبع ہوا۔

۲- دوسرا ترجمہ میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ نے تیار کیا جس کے دس پارے بیان القرآن المعروف بہ تعلیم القرآن کے نام سے چھپ چکے ہیں۔

۳- دیگر تراجم قرآن میں مولانا مفتی ضیاء الدین بخاری کا ترجمہ، اس میں مولانا محمد یحییٰ شاہ (م ۱۹۸۰ء) کا نامکمل ترجمہ شامل ہے۔

۴- مولانا سید میرک شاہ اندرابی مرحوم نے ۲۵ پاروں کی تفسیر اور ترجمہ مکمل کئے۔

۵- پارہ عم کشمیری زبان میں لکھی گئی ایک تفسیر بنام نور العیون از محمد یحییٰ، یہ ۱۹۱۰ء میں امرت سر سے شائع ہوئی۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) دیکھئے برصغیر میں مطالعہ قرآن، فکر ونظر خصوصی اشاعت ۱۹۹۹ء، جلد ۳۶، شمارہ ۳ و ۴، ص ۶۸، ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد (حذف واختصار کے ساتھ) (۲) ایضاً ص ۶۹ (۳) ایضاً (۴) پروفیسر شعبہ عربی بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی ملتان نے اس تفسیر کی تحقیق کی ہے اور ۱۹۹۷ء میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے پی ایچ ڈی عربی میں ڈگری حاصل کی ہے (۵) دیکھئے گیلانی، مناظر احسن مولانا: ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، مکتبہ رحمانیہ لاہور ۲/ ۲۵۸ (۶) دیکھئے مطالعہ قرآن، ص ۸۱ (۷) دیکھئے اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۱/ ۱۶، ۶۱۵ (۸) امام راغب اصفہانی (م ۵۰۲) کی مفردات غرائب القرآن بہت مشہور ہے، ان کے علاوہ اس موضوع پر اخفش (م ۳۱۵) فراء (م ۲۰۷)، ابن قتیبہ (م ۲۷۶) اور ابو حیان اندلسی (م ۷۴۵) کی کتابیں قابل ذکر ہیں (۹) شیخ محمد مراد بخاری کشمیری نے اس موضوع پر بارہویں صدی ہجری میں ایک جامع کتاب مفردات لکھی جو ۱۱۳۱ء میں مکمل ہوئی، اس کتاب میں ہر لفظ کے معنی عربی، فارسی اور ترکی تینوں زبانوں میں دئے گئے ہیں، اس کا فارسی مکتوبہ ۱۱۲۹ء میں کتب خانہ جامعۃ الازہر میں محفوظ ہے (۱۰) ماہنامہ شریعت سکھر، اکتوبر ۱۹۸۱ء، ص ۷۵ (۱۱) قدوائی: ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں، مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۲۰۳ (۱۲) دیکھئے صدیقی، محمد میاں ڈاکٹر: قرآن مجید کا عربی اردو لغت، ص ۲ (۱۳) علوی، ابو مسعود حسن: تدریس لغات القرآن، ص ۶ (۱۴) محمد اسحاق بھٹی ارمغان حنیف: ص ۳۱-۳۳ (۱۵) صدیقی ڈاکٹر محمد میاں: قرآن مجید کا عربی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۹۶ء، ص ۳ (۱۶) دیکھئے اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۱/ ۱۶-۶۱۵ (۱۷) ایضاً۔

اخبار علمیہ

ریاض کے ہفت روزہ ''الدعوہ'' میں مسلم علما اور محققین کے لئے یہ مسرت بخش خبر شائع ہوئی ہے کہ ایک انٹرنیشنل کمپیوٹر کمپنی ''صخر'' نے قرآن مجید کو کمپیوٹرائز ڈ کرنے کے بعد اب احادیث نبوی کو بھی کمپیوٹرائز ڈ کرنے کا کام شروع کردیا ہے، صخر کے ڈائریکٹر جناب علی محمد الضمیری نے بتایا کہ قرآن مجید کے بعد حدیث نبوی اسلام کا دوسرا بنیادی ماخذ ہے، اس لیے کمپنی نے اب دوسرے مرجع کو بھی کمپیوٹرائز ڈ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کے لیے سب سے پہلے اس نے ''بخاری شریف'' کو منتخب کیا ہے، کمپنی کا مقصد جدید ٹکنالوجی کے ذریعہ اسلام کے دینی و علمی ورثہ کو مسلم علما اور دانشوروں کے درمیان متداول ومقبول بنانا ہے، رپورٹ کے مطابق احادیث قدسی، احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ وتابعین پر مشتمل ۷۰۰۰ روایتیں کمپیوٹر میں داخل کی جاچکی ہیں، اس کا مقدمہ فن حدیث کے اصول ومبادی کے علاوہ امام بخاری کی صحیح اور ان کے سوانح کے بارے میں مفید معلومات پر مشتمل ہے۔

مغربی جرمنی کے آخر میں واقع شہر ''آخن'' پورے جرمنی میں اعلا تعلیمی مرکز کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہے، ۱۹۵۸ء میں اس شہر میں مرکز اسلامی کے قیام کا خیال زیر غور آیا اور ۱۹۶۴ء میں اس کا باقاعدہ سنگ بنیاد رکھا گیا، چند مہینے قبل اس ادارے نے اپنی سلور جبلی منائی جس میں اسلامی علوم اور ادارے کی سرگرمیوں کے متعلق لیکچروں کا اہتمام بھی کیا تھا جن میں اس کے مقاصد اور آیندہ کے مختلف منصوبوں کا جائزہ لیتے ہوئے ادارے کے عام مسلمانوں سے روابط، تعلیم اطفال اور مسلمانوں کو درپیش چیلنجز وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی، اس کے علاوہ جدید ثقافت پر مشتمل مرکز اور ایک اوپن یونی ورسٹی کے قیام کی تجویز پر بھی غور کیا گیا، جرمنی کے اخباروں نے شہر آخن کے اس ادارے کی ثقافتی، علمی، تعلمی سرگرمیوں کی خبریں بڑے اہتمام سے شائع کی تھیں۔

رابطہ اسلامک نیوز ایجنسی کے مطابق انٹرنیشنل اسلامی رفاہی مشن کا بنیادی مقصد عالم اسلام میں تعلیم کی ترویج ہے، اس کے لیے وہ قدیم مدرسوں کی تعمیر وترقی میں تعاون بھی کررہا ہے اور نئے مدرسے بھی قائم کررہا ہے، اس کے موجودہ ڈائریکٹر عبدالرزاق ظفر کا بیان ہے کہ اس

ادارے کے تحت اب تک افغانستان میں کل چھ مدرسے میران شاہ اور مانیرا کیمپ میں قائم کئے گئے ہیں جو بہ حسن خوبی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل کررہے ہیں، پاکستان اور افغانستان میں مجاہدین کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے چار سوانٹر میڈیٹ کالج قائم کئے ہیں جن میں ۲۲ ہزار کے قریب طلبا زیر تعلیم ہیں، تھائی لینڈ کے مدرسہ ادریسیہ اور رحمانیہ میں ٹیکنیکل تعلیم اور لڑکیوں کے ہاسٹل کی تعمیر کے لیے بھی اس نے مالی تعاون کیا ہے، کینیا کے تیرہ مدرسوں میں اساتذہ اور تعلیمی ضرورتوں کے لوازم واسباب فراہم کیے ہیں، یوگینڈا کے بارہ مدرسوں کے معلمین کی تنخواہوں کا انتظام کیا ہے، ایتھوپیا کے صوبہ ''ولو'' کے مدرسہ کا قیام، چاڈ میں قائم پچاس مدارس کے علاوہ سینگال کے تمام مدارس اسلامیہ کی مکمل کفالت کا سہرا اسی بین الاقوامی اسلامی رفاہی مشن کے سر ہے، نیز بچوں کی زرعی ٹریننگ کے لیے ایک وسیع وعریض زرعی فارم بھی اسی ادارے نے قائم کیا ہے۔

سعودی روزنامہ الوطن کی اطلاع ہے کہ علی بن سعید القحطانی نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس کے استعمال سے نومولود شیرخوارگی کے وقت کوئی گھٹن محسوس نہیں کریں گے، یہ آلہ دو پایوں پر مشتمل ہے اور چند مہینوں میں اسے ارزاں اور معمولی قیمت پر بازاروں میں مہیا کرادیا جائے گا، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بسا اوقات شیرخوار بچے گھٹن کے سبب دم بھی توڑ دیتے ہیں تاہم اب وہ اس عارضہ سے محفوظ رہیں گے۔

جامعہ ملک عبدالعزیز جدہ کے شعبہ اقتصادیات کے ذمہ داروں نے طے کیا ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کو ایسے مناسب انداز اور بہتر ڈھنگ سے پیش کریں گے کہ موجودہ عالمی اقتصادی نظام پر اس کی برتری خود آشکارا ہوجائے، اس پروگرام کے تحت انہوں نے ماہرین اقتصادیات سے اس پر بحث ومباحثہ، مقالات لکھوانے اور انہیں شائع کرنا شروع کردیا ہے، یونی ورسٹیوں میں اسلامی اقتصادیات کی اعلا تعلیم اور ایسی لائبریری کا قیام بھی ان کے مقاصد میں شامل ہے جس میں اس موضوع سے متعلق کتابیں دست یاب ہوں، شعبہ ایسے ماہرین کی ٹیم تیار کرے گا جو تدریس کے علاوہ اسلامی اقتصادیات پر مشتمل مقالات کی نگرانی بھی کرسکے، اس منصوبے کے تحت انٹرنیشنل سمینار بھی منعقد کئے جاتے ہیں جن میں اطراف عالم کے مندوبین شرکت کرتے ہیں۔

واشنگٹن کے اسلامی سینٹر کی سالانہ روداد سے پتہ چلا کہ اس نے اسلامی علوم وفنون اور

دیگر موضوعات پر ۹ ہزار کتابیں شائع کی ہیں، نیز امریکہ میں قائم محمد بن سعود یونی ورسٹی کے ایک شعبہ کی نگرانی میں بہت منصوبہ بند طریقے سے ایمہ اور مبلغین کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی جارہی ہے، تین برس کے عرصے میں یہ ادارہ فرانس، امریکہ، برطانیہ اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں اپنی متعدد شاخیں بھی قائم کرچکا ہے جو اپنے اپنے ملکوں اور علاقوں میں اسلامی موضوعات پر لکچر کراتے اور دعوتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہیں۔

تائیوان میں کل ایک لاکھ مسلمان آباد ہیں جن میں سے قریباً تیس ہزار اس کی راج دھانی میں بودوباش رکھتے ہیں، ان میں دینی شعور بھی ہے اور وہ اپنے دینی شعائر کا تحفظ بھی کررہے ہیں، راج دھانی کی ایک اہم شاہ راہ پر ایک بڑی عالی شان جامع مسجد ہے جس میں مردوں اور عورتوں کی نماز پڑھنے کی جگہیں الگ الگ ہیں، اس میں ایک کانفرنس ہال بھی ہے جس میں دینی تقریبات اور اسلامی تہواروں کے موقع پر مسلمان اکٹھا ہوتے ہیں، اسی سے متصل ایک لائبریری ہے جس کی اکثر کتابیں عربی میں ہیں لیکن تائیوانی مسلمانوں کی عربی زبان سے عدم واقفیت ان سے استفادے میں مانع ہے، تاہم بعض کتابیں چینی زبان میں ترجمہ کی گئی ہیں، مسجد کے امام چین کی قومی یونی ورسٹی میں صدر شعبہ عربی ہیں اور جمعہ کا خطبہ فصیح عربی میں دیتے ہیں۔

کویت نیوز کے مطابق عرب کے ادارہ برائے منصوبہ بندی نے ''ادارہ اور اس کی ترقیاتی کارکردگی پر ایک کتاب شائع کی ہے جس میں عالم عرب کے اداروں کی جانب سے سماجی اور اقتصادی پالیسیوں اور کوششوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

صراط مستقیم، برمنگھم نے ایک یہودی اخبار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ فلسطین کے یہودی نوجوانوں میں گزشتہ ۳۵ برسوں سے قبول اسلام کا جو رجحان پیدا ہوا ہے، اس کے مطابق ۲۰۰۳ء میں ۴۰، ۲۰۰۴ء میں ۲۷، ۲۰۰۵ء میں ۳۵ یہودی نوجوانوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ حلقہ بگوش اسلام لوگوں کی اکثریت خواتین پر مشتمل ہے، اسلام قبول کرنے والوں کی خاصی تعداد ایسی بھی ہے جو غور وفکر اور مطالعہ و تحقیق کے بعد دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے ہیں، واضح ہو کہ فلسطین کی اسلامی عدالت مکمل تحقیق و تفتیش کے بعد ہی کسی کو مسلمان ہونے کی سند عطا کرتی ہے۔

ک۔ص اصلاحی

تلخیص و تبصرہ

زینب الغزالی

از:- ڈاکٹر عائشہ کمال

گزشتہ صدی کے نصف آخر میں جن عورتوں نے بہت شہرت و ناموری پائی، ان میں اسلام پسند عورتوں کو وہ شہرت و مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو دوسرے فکری رجحانات کی حامل عورتوں کو ملی، ان عورتوں کا حلقہ اثر صرف اسلام پسند طبقے میں ہی محدود رہا، بخلاف مشہور سیکولر عورتوں کے جن کو عربی و مغربی پروپیگنڈہ مشنری نے بہت نمایاں کیا اور انہیں عام لوگوں اور عربی عورتوں کے لیے بہ طور نمونہ پیش کیا، حالاں کہ حقیقتاً وہ عورتیں مغربی تابع داری کا نمونہ تھیں اور انہوں نے اپنی ذات کو اسلام کے بھولے بسرے رجسٹر کے صفحات سے مٹا دیا تھا، ہم یہاں ایک ایسی عورت کی سیرت پیش کر رہے ہیں جس نے اسلام کے فروغ کے لیے بڑی جدوجہد کی اور ثابت کیا کہ جہاد عورتوں پر بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح مردوں پر، وہ عورتوں کی بے لگام آزادی کے بجائے انسانوں کو آزاد کرانے کے لیے سرگرم عمل رہیں۔

زینب غزالی الجبیلی ۲ر جنوری ۱۹۱۷ کو مصر کے صوبہ ''بحیرہ'' کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئیں اور ۳ر اگست ۲۰۰۵ء کو وفات پائی، باپ کی طرف سے ان کا نسب حضرت عمر بن خطابؓ اور ماں کی طرف سے حضرت حسن بن علیؓ تک پہنچتا ہے، ان کے دادا روئی کے مشہور تاجر تھے اور والد ازہر شریف کے علما میں سے تھے، جن کی دینی تربیت نے زینب پر بہت زیادہ اثر ڈالا، اپنی بیٹی کا نام انہوں نے جلیل القدر صحابیہ سے تبرک حاصل کرنے کے لئے نسیبہ رکھا تھا، نسیبہ بنت کعب المازنیۃ الانصاریۃ نے جنگ احد میں نیزے اور تلوار کی مار کے تمغے حاصل کئے، جب لوگ نبی ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے، اس وقت بھی یہ ثابت قدم رہیں، زینب کے والد نے ان کے لیے ایک لکڑی کی تلوار بنائی تھی، وہ زمین پر ایک دائرہ بناتے اور ان سے کہتے کہ کھڑی ہو جاؤ اور اللہ کے دشمنوں کو مارو، وہ بیچ میں کھڑی ہو تیں دائیں بائیں سامنے اور پیچھے تلوار چلاتیں پھر ان کے والد پوچھتے کہ رسول اللہ اور اسلام کے کتنے دشمنوں کو گرایا، تو یہ چھوٹی سی مجاہدہ کہتیں

کہ ایک، تو وہ کہتے دوبارہ مارو پھر یہ بچی اپنی تلوار ہوا میں چلاتی اور کہتی دو، تین چار، زینب اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنی والدہ کے ساتھ قاہرہ منتقل ہو گئیں، جہاں ان کے بھائی پڑھتے اور کام کرتے تھے، ان کے بڑے بھائی محمد علی نے زینب کے اصرار کے باوجود ان کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی، بھائی اپنی والدہ سے کہتے کہ والد نے زینب کو بڑا جرأت مند بنا دیا ہے، وہ صرف اپنی عقل کی آواز سنتی ہے، جو کچھ اس نے اپنے گاؤں میں تعلیم حاصل کی ہے وہ کافی ہے، والدہ کا بھی یہی خیال تھا کہ ان کو بھائی کی بات ماننا چاہئے، کیوں کہ وہ اس کے والد کی جگہ پر ہیں لیکن دوسرے بھائی علی کا خیال تھا کہ زینب کو علم حاصل کرنا چاہیے، تا کہ ان کی ذہنی و دماغی تربیت ہو، چنانچہ وہ ان کے لیے کتابیں لاتے جس میں سے ایک کتاب عائشہ تیموریہ کی تھی، اس میں عورتوں کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، زینب نے اس کو کئی بار پڑھا، اس کتاب کے کئی پیراگراف ان کو حفظ ہو گئے تھے لیکن انہوں نے آزاد قرأت کو کافی نہیں سمجھا، جب وہ بارہ سال کی ہوئیں تو ایک دن ''شبرا'' محلہ میں سڑکوں پر گھومنے لگیں، اسی اثنا میں ان کو لڑکیوں کا ایک اسکول نظر آیا انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا، جب دربان نے مقصد پوچھا تو انہوں نے کہا میں پرنسپل سے ملنے آئی ہوں، اس نے پوچھا کیوں؟ انہوں نے پختگی سے جواب دیا، میں سیدہ زینب الغزالی معروف بہ نسیبہ بنت کعب المازنیہ ہوں اور میرا ان کے ساتھ وقت مقرر ہے، چوکیدار نے اندر جانے دیا اور اس چھوٹی سی بچی کے انداز پر تعجب کرتا رہا۔

پرنسپل کے دفتر میں داخل ہوتے ہی زینب نے السلام علیکم کہا اور کہا میں سیدہ زینب الغزالی ہوں اور میں نسیبہ بنت کعب المازنیہ ہوں، پرنسپل نے ان کو دیکھا تو یہ خیال ہوا کہ کوئی پاگل لڑکی ہے پھر پوچھا آپ کو کیا کام ہے اور آپ یہاں کیوں آئی ہیں، اس نے پورا قصہ سنایا اور تعلیم کے سلسلہ میں بھائی کی رائے بتائی اور کہا اس کو بہ طور طالبہ اس اسکول میں داخلہ دے دیا جائے، جب پرنسپل نے ان کے والد اور بھائی کے بارے میں پوچھا تو وہ اور ان کے خاندان کو جان گئے کہ ان کے والد ازہر شریف سے فارغ اور دادا مشہور تاجر تھے، پرنسپل نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ یہ جرأت مند اور ذہین ہے، پرنسپل نے کہا اس بھائی کو لانا جو تمہاری تعلیم کے مؤید ہیں، تا کہ اسکول میں داخلہ دیا جائے، بچی کے انٹرویو کے بعد اسے پہلے کلاس میں عارضی داخلہ دے دیا گیا، پھر دو

مہینے بعد ایک ٹیسٹ لیا گیا جس کے بعد دوسرے کلاس میں ترقی دے دی گئی، اس طرح پڑھائی کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

اسکولی تعلیم کے ساتھ ساتھ زینب دینی علوم مصر کے مشہور و معروف مشائخ سے پڑھتی تھیں جن میں عبدالحمید الملبان، محمد سلیمان النجار، شیخ علی محفوظ قابل ذکر ہیں، اس طرح زینب نے دینی و دنیوی تعلیم ایک ساتھ حاصل کی، ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے کسی اخبار میں Women Association کے بارے میں جانا جس کی صدر ہدیٰ شعراوی تھیں، وہ تین طالبات کے ایک گروپ کو تعلیم کے لیے فرانس بھیجنا چاہتی تھیں، زینب کی تمنا تھی کہ کاش وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو کر فرانس جاتیں، اس لیے وہ ان کے آفس گئیں اور ہدیٰ شعراوی سے ملاقات کی، یہ وہی آزاد خیال عورت ہیں جنھوں نے مصر اور عرب عورتوں کو بگاڑنے میں بڑا کردار ادا کیا، انہوں نے بہت کرم کا معاملہ کیا اور بھائی پر غصہ کیا کہ وہ پڑھائی سے کیوں روکتا ہے اور اپنی یونین میں شامل کرلیا اور خوشی کا اظہار کیا اور سمجھا کہ ایک قیمتی شکار ہاتھ آگیا ہے، زینب ایک بہترین خطیبہ و مقررہ تھیں، ہدیٰ ان کو پیش پیش رکھتیں، تقریر کرواتیں، ان کا یہ خیال تھا کہ یہ لڑکی نائب ہوگی، زینب کو بہت جلد معلوم ہوا کہ وہ ڈیلیگیشن میں سب سے آگے ہیں جس کی ان کو تمنا تھی لیکن اللہ تعالیٰ ان سے کچھ اور ہی کام لینا چاہتا تھا، ڈیلیگیشن کے ممبران کے جانے کا وقت ایک ماہ بعد مقرر ہوا، زینب بہت خوش ہو کر دن گن رہی تھیں کہ ایک روز انہوں نے اپنے والد کو خواب میں دیکھا کہ وہ ان سے کہہ رہے ہیں، اے زینب تم فرانس نہ جاؤ، مصر میں اللہ تعالیٰ تم کو اس سے بہتر دے گا جو فرانس کے وفد کے ساتھ جا کر حاصل کرنا چاہتی ہو، انہوں نے خواب میں پوچھا کیسے؟ تو والد نے کہا عنقریب تم دیکھو گی لیکن تم سفر نہ کرنا اس لئے کہ میں تمہارے سفر سے راضی نہیں ہوں، جلد ہی خواب نے اپنا اثر دکھایا، زینب نے سفر سے انکار کر دیا، ہدیٰ شعراوی دہشت زدہ ہوگئیں، زینب سے ان کو بڑی توقعات وابستہ تھیں اور وہ ان کو ایک اہم ممبر کے طور پر تیار کر رہی تھیں، زینب نے ان کو اپنا خواب سنایا، انہوں نے کہا بعض خواب پورے ہوتے ہیں بعض نہیں، اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو، انہوں نے ان کو روتے ہوئے سینہ سے چمٹایا لیکن زینب اپنے موقف پر قائم رہیں اور بولیں کہ میں اپنے والد کی بات پر قائم رہوں گی۔

زینب یونین کی اہم ممبر کی حیثیت سے کام کرتی رہیں، بعض ممبران ان کی تقریر پر معترض تھیں، کیوں کہ ان کی تقریروں میں اسلامی انداز ہوتا تھا جو ان گمراہ عقلوں کے لیے پچھڑے پن کی علامت تھا، زینب برابر ہدیٰ شعراوی کے نعروں کو بلند کرتی رہیں اور عورت کی ثقافتی و اجتماعی ترقی کے پلان کو ہاتھ میں لئے رہیں، ابتدا میں وہ بڑی کشمکش میں تھیں، اجتماعی ظلم و زیادتی اور ان پرانی عادتوں اور اسلام کے غلط مفاہیم کے خلاف جن کو غلط طور پر اسلام کا لبادہ اوڑھا دیا گیا تھا، زینب کے اندر ایک بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوا، انہوں نے ہدیٰ شعراوی کے پلان کو اسلام کی بنیاد پر قائم کیا تھا جس میں بہت سی لڑکیاں بہ آسانی گرفتار ہو جاتی تھیں جب کہ چمک دار آزادی کے نعرے ان کی دبی ہوئی آرزوؤں کو دین کے نام پر بھڑکاتی تھیں اور وہ اس سے دھوکا کھا جاتی تھیں، زینب نے ازہر کے خلاف سخت فکری جنگ چھیڑی جو کہ عورت کی آزادی کے چھپے ہوئے خطرہ کو سمجھ چکا تھا، زینب بڑے اطمینان سے جن چیزوں کو اچھا سمجھتی تھیں ان کی مدافعت کرتی رہیں، جامع ازہر نے کئی اجتماعات ان کے ساتھ منعقد کیے، تاکہ دلیل کا دلیل سے مقابلہ کریں اور مغربی سازش ختم کرنے کی کوشش کریں، جو وہ مسلمان عورت کے ساتھ کر رہا ہے، ہدیٰ شعراوی نے ان اجتماعات کی نمایندگی کے لیے تین دوشیزاؤں کو منتخب کیا، زینب، سیزا نبراوی اور حواء ادریس جو شعراوی کی ماموں زاد بہن تھیں۔

اس طرح کی میٹنگ میں ازہر کے مشائخ نے بتایا کہ ہدیٰ شعراوی کی پکار کا مطلب مسلمان عورت کا اپنے دین کو چھوڑ دینا ہے، زینب نے ہدیٰ شعراوی اور عورتوں کی ترقی، ان کی عقل و فہم بڑھانے کے پلان کا زبردست دفاع کیا بلکہ انہوں نے ایک دن ازہر کے دس مشائخ پر کامیابی حاصل کی اور وہ ان کے سامنے لاجواب ہوگئے بالکل اس طرح جیسا کہ بعد میں جمال عبدالناصر وغیرہ ان کی عزیمت و ارادہ کا مقابلہ نہ کر سکے، اس سے حضور ﷺ کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا "جو تم میں سے جاہلیت میں بہتر تھا وہ اسلام میں بھی بہتر ہوگا"۔

ان علما نے وعظ و ارشاد کے صدر عبد ربہ مفتاح سے درخواست کی کہ ان کو تقریر کرنے سے روک دیا جائے لیکن وہ دور بین تھے، زینب نے دس علما کو شکست دی تھی، انہوں نے کہا اگر ہم ان کو وعظ سے روک دیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہماری رائے غلط ہے اور وہ جو دعویٰ

کرتی ہیں وہ سچ ہے، اس لئے ان سے مقابلہ جاری رکھا جائے۔

شیخ محمد نجار کو ان سے مناظرہ کا پابند کیا گیا، وہ ان کی عقل مندی اور خوش بیانی کی داد دیتے رہے اور دونوں میں مقابلہ ہوتا رہا اور یہ ان کو شکست دینے کی کوشش کرتی رہیں، شیخ ان کو غور سے سنتے رہے کہ وہ کس طرح ہدیٰ شعراوی اور اس کی یونین کی مدافعت کررہی ہیں، شیخ ان کی قوت بیان و فصاحت کلام کو ملاحظہ کرتے رہے اور زینب کی بات ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے، جب بات ختم ہوئی تو دھیرے سے ان کی طرف یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے، اے بیٹی کیا میں اسلام کی دعوت کے بارے میں تم سے تھوڑی گفتگو کرسکتا ہوں؟ انہوں نے مہذب طریقے سے اثبات میں جواب دیا اور ان سے بات چیت کرنے کے لئے بیٹھیں، شیخ نے اپنے رب کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ''اے اللہ میں تیرے متبرک نام اور تیری کتاب جس کو تونے ہمارے نبی ﷺ پر نازل فرمائی، تو ہر چیز پر قادر ہے، میں سوال کرتا ہوں تجھ سے کہ تو ان کا رخ اسلام کی طرف موڑ دے''۔

شیخ کی دعا کی نرمی، عاجزی و انکساری اور رقت سے زینب کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں اور ان کا نفس متاثر ہوا، انہوں نے آنسو ضبط کرتے ہوئے شیخ سے پوچھا، آپ مجھے ایسا کیوں سمجھتے ہیں کیا میں سچی پکی مسلمان نہیں؟ جب کہ میں نماز پڑھتی ہوں، روزہ رکھتی ہوں، قرآن کی تلاوت کرتی ہوں اور جب استطاعت رکھوں گی تو حج بیت اللہ کروں گی اور میں تمنا کرتی ہوں کہ اللہ کے راستہ میں شہید ہوں، شیخ نے کہا میں تم سے ایسی ہی امید کرتا ہوں، انہوں نے اس کو پھر پکارا اور کہا کیا تم یہاں سے اٹھنے کے بعد ہدیٰ شعراوی کے طرز عمل پر چلوگی یا اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلوگی؟ زینب نے کہا میں ہدیٰ شعراوی کے ساتھ ہوں اور میرا نفس اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ ہے لیکن حق میری مدد کرے گا، ان کے تعلقات شیخ کے ساتھ برقرار رہے، انہوں نے ان کو وہ باتیں بتائیں جن سے وہ ناواقف تھیں، زینب کی زندگی میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے ان کی زندگی کو بدل دیا، ایک دن زینب اپنے گھر میں کھانا پکا رہی تھیں، گیس کا سلنڈر پھٹ گیا، وہ بری طرح جھلس گئیں، غیر محرموں کے سامنے وہ بے حجاب ہوں گی اس ڈر سے انہوں نے باہر علاج کرانے سے انکار کردیا، وہ سخت بیمار ہوگئیں، طبیب

نا امیدی کے ساتھ گھر پر ہی علاج کرتے رہے، روز بہ روز ان کی صحت خراب ہوتی جارہی تھی، ایک دن انہوں نے اپنے بھائی کی آواز سنی کہ وہ دھیرے سے گھر والوں سے کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے اور یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اس کی زینب کو خبر نہ ہو، وہ خطرہ میں ہے، بھائی پر اضطراب کا عالم تھا، انہوں نے یہ سب سنا تیمم کیا اور نماز پڑھنے لگیں اور دعا مانگی کہ اے اللہ مجھ کو ہدیٰ شعراوی کی جماعت کا ممبر بننے کی سزا ملی ہے، تو مجھ سے ناراض ہے، اے رب میں پکا عزم کرتی ہوں اور تجھ سے التجا کرتی ہوں کہ اگر تو نے میری صحت لوٹادی تو میں ایسوسیئیشن سے استعفیٰ دے دوں گی اور اسلامی دعوت کو پھیلانے کے لیے ایک جماعت بناؤں گی اور مسلم بہنوں کو صحابیات کے راستہ پر چلنے کی دعوت دوں گی اور حسب قدرت اس راستہ میں جہاد کروں گی اور اس کی دعوت دوں گی، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور اپنی رحمت نازل فرمائی، کرم کیا، شفا کا معجزہ برپا ہوا، زینب کی دعوت آسمان تک پہنچ گئی، جب کہ طبیب ناامید ہوچکے تھے اور دوا نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا تھا، زینب نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے مشن میں لگ گئیں، ان کا دل ایمان کی دولت سے مالا مال ہوگیا، عورتوں کی یونین سے استعفیٰ دیا، ان کے شبہات ختم ہوگئے اور حقیقت سامنے آگئی، ہدیٰ شعراوی نے بہت کوشش کی کہ اپنی قراردادوں سے زینب کو متاثر کریں، وہ رو رو کر زینب سے کہہ رہی تھیں، اے زینب میں تم کو اپنا نائب بنانا چاہتی تھی، زینب نے جواب دیا میں نے وہ اختیار کیا جو میرے اللہ نے میرے لئے منتخب کیا ہے، میں اس کے ساتھ ہوں اور میں آپ کی وفا شعار بیٹی کی طرح ہوں، آپ کے اخلاق عالیہ اور احسان کو ہمیشہ یاد رکھوں گی، ان کے اور زینب کے عام تعلقات کبھی منقطع نہ ہوئے، ہدیٰ کی حجاب کے بارے میں رائے اور ان کے الحاد کے باوجود زینب کو ہدیٰ شعراوی کے ایمان میں بالکل شک نہیں تھا، وہ ان کی بھلائی کا ذکر کرتے ہوئے کہتیں کہ وہ فقرا کی مدد کرتی، بھلائی کے کام کرتی ہیں، بیت اللہ کا حج کیا اور بہت سے لوگوں کو اس کا علم نہیں کہ جب ہدیٰ شعراوی سخت بیمار ہوئیں تو انہوں نے زینب کو بلایا، انہوں نے ان کی آرزو پوری کرتے ہوئے ان سے ملاقات کی اور ان کے جنازہ میں شریک ہوئیں، اسی طرح زینب اسلامی پس منظر میں عورت کی آزادی کی دعوت دیتی رہیں اور اس بات کی تردید کرتی رہیں کہ اسلام میں عورت کو بہت پچھڑا ہوا بتایا گیا ہے،

انہوں نے عملاً مسلم عورتوں کے دعوتی کردار کو ثابت بھی کر دکھایا، انہوں نے ۱۹۳۷ء میں مسلم خواتین کی ایک ایسوسیئیشن بنائی اور وزارت اوقاف سے اس کو رجسٹرڈ بھی کرایا، اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال تھی، انہوں نے پندرہ مسجدیں تعمیر کیں، اس مختصر مدت میں وعظ کرنے والی عورتیں دعوت کے لئے نکلیں اور محلے کی مساجد میں قیام کیا، سال میں ۱۱۹ اجتماعات منعقد ہوئے انہوں نے ایک اسلامی رسالہ بھی جاری کیا، اس کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی، انہوں نے دو دہوں کے درمیان بہت زیادہ تعداد کو اپنی طرف کھینچا جس میں زیادہ تر اہم عورتیں تھیں۔

اسلامی دعوت کو پھیلانے کے لئے انہوں نے عرب و اسلامی ممالک کی زیارت کی اور دینی تقریریں کیں اور دعوت الی اللہ کے مفہوم کو بہت واضح کیا، دعوت کے میدان میں ۵۳ سال یعنی نصف صدی سے بھی زیادہ گزارا، اس درمیان اسلامی دعوت کے عالموں اور ماہرین سے بھی ملیں، وہ شیخ حسن بنا کے اسلامی افکار سے زیادہ متاثر تھیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی ایسوسیئیشن کو ان کی جماعت ''الاخوان المسلمون'' میں شامل کر دیا، دراصل پہلے الغزالی نے ''الاخوات المسلمات'' کی بنیاد رکھی اور بعد میں اسے اخوان المسلمون میں شامل کر دیا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورتیں بغیر مرد کے بھی اسلامی خدمات انجام دے سکتی ہیں، حالاں کہ آج کل ہر جماعت عورتوں کا ایک سیکشن اپنے ساتھ جوڑ لیتی ہے جس میں مردوں کی مکمل تابع داری ہوتی ہے اور وہ فعالیت نظر نہیں آتی جو ہونا ضروری ہے، ان کی ایسوسیئیشن نے صرف خیر کے کاموں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ سیاسی عمل سے بھی جڑ گئی جو کہ اجتماعی عمل کا حصہ ہے کیوں کہ سیاست، ثقافتی و اجتماعی امور اور اعمال خیر پر اپنا اثر ڈالتی ہے جب کہ اس جمعیت کا مقصد اسلام کا دفاع، شریعت اسلامی کا قیام اور مسلمانوں کو اللہ کی کتاب کی طرف بلانا ہے، اس لیے ان کا سخت ٹکراؤ تمام سیاسی جماعتوں اور اصحاب اقتدار سے ہوا اور اس ٹکراؤ کی انتہا یہ تھی کہ انہوں نے ۲۰؍اگست ۱۹۶۵ء کو جمال عبدالناصر سے ملنے سے انکار کر دیا جس پر ان کو گرفتار کر لیا گیا، انہوں نے صدر کے قاصد سے اپنی معروف جرأت کے ساتھ کہا کہ میں اس شخص سے نہیں مل سکتی جس کے ہاتھ شہید عبدالقادر عودۃ کے خون سے رنگے ہوں، ان کو جیل میں شدید تکلیفیں دی گئیں لیکن ان کی جماعت حکومت میں شوریٰ کے اصولوں کا مطالبہ کرتی رہی، زینب نے اپنی شدید تکلیفوں کا ذکر اپنی کتاب ''ایام من حیاتی'' میں

کیا ہے جو کہ معاصر اسلامی دعوت کی بہت اہم تاریخ ہے، جس کا تعلق ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۱ء تک کے خاص عہد سے ہے، اس کتاب میں اسلامی دعوت کے بعض اہم قائدین کا تذکرہ ہے جنہوں نے اسلامی شریعت کو باقی رکھنے کے لئے بہت بڑا کردار ادا کیا، اسی طرح اس کتاب کی ادبی اہمیت بھی ہے کیوں کہ اس کی عبارتیں بہت موثر ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایسے صاحب قلم ادیبہ کی تحریر ہے جس کے احساسات بہت نازک تھے۔

زینب غزالی مسلمان عورت کے مستقبل سے پرامید تھیں اور یہ چاہتی تھیں کہ مسلم عورتوں کو مسلم عورتوں کی قیادت حاصل رہے، اس میں شبہ نہیں ہے کہ عالم اسلام کی ترقی و تجدید اور سوسائٹی کی اٹھان عورت سے شروع ہو کر عورت پر ختم ہوتی ہے، عورتوں کی آزادی کی دعوت دینے والوں نے عورت کی سمجھ کو گمراہ کیا، اس کو اپنے آپ کو سنوارنے، ابھارنے اور آدمی سے جھگڑا کرنے میں مشغول کر دیا اور اجتماعی و دینی صفات سے تغافل برتا، وہ عرصہ دراز سے اس نادر موتی کی چوری میں لگے ہوئے ہیں لیکن بالآخر وہ ناکام ہوں گے، اس موج نے بہت سے موتیوں کو نگل لیا ہے جب کہ زینب کو یہ بری موجیں نہ نگل سکیں اور وہ اپنے دین پر جمی رہیں، اسی بنیاد پر وہ آگے بڑھیں اور دوسروں کے لئے نمونہ بن کر ثابت کر دیا اور اپنی اہمیت کو تسلیم کرایا۔

میناروں کی تاریخ

مورخین، مسلم سیاحوں اور ماہرین آثار قدیمہ نے مئذنہ، منار، منارہ، اور صومعہ وغیرہ کے لفظی معنی تقریباً ایک ہی لکھے ہیں، یعنی وہ بلند و بالا جگہ جہاں سے موذن اذان دیتا ہے، البتہ اس جگہ کو منارہ کیوں کہا جاتا ہے اور ابتدا میں اس کی تعمیر کا مقصد کیا تھا اس کے متعلق ان میں اختلاف پایا جاتا ہے، ڈاکٹر سید سعد زغلول عبدالحمید کے خیال میں:

''مئذنہ کو منارہ اس لئے کہا گیا کہ اس کے اوپر روشنی کی جاتی تھی تاکہ مسافروں زائروں اور تاجروں کو اپنا راستہ طے کرنے میں آسانی ہو اور یہ ان کی رہبری کا کام دیں اور دوسرا مقصد اہل شہر کو بحری دشمنوں کے خطرات سے آگاہ اور چوکنا کرنا تھا بایں طور کہ میناروں کے اوپر آگ روشن کر دی جاتی تھی یا اس پر دھواں کر دیا جاتا تھا، اسی لیے اس کو منارہ سے موسوم کیا گیا، یہ گویا

ایک قسم کا اشارہ تھا کہ اہل شہر دشمنوں سے ہوشیار ہو جائیں۔

عہد اموی کی ابتدا میں مینارے، محراب و منبر کی طرح مسجد کا جز سمجھے جاتے تھے، خلفا، سلاطین اور امرا ان کی تعمیر میں خاص طور سے دلچسپی لیتے تھے اور انہیں خوب سے خوب تر بنانے میں ایک دوسرے پر گوئے سبقت لے جانا چاہتے تھے اور مختلف طرز و انداز کے مینارے بنا کر اپنی فنی مہارت کا مظاہرہ کرتے تھے، جن محققین کو اسلامی فنون اور مسلمانوں کی تعمیرات سے دلچسپی ہے مینارہ بھی ان کا مرکز توجہ ہیں، ہر قوم کا اپنا الگ مذاق اور ہر زمانے کا اپنا جدا طرز ہوتا ہے، جس کا اثر عمارتوں اور عبادت گاہوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے تاہم یہ امر حیرت انگیز اور دلچسپ ہے کہ زمان و مکان کی دوری کے باوجود مساجد کے میناروں میں بڑی حد تک مشابہت اور مماثلت نظر آتی ہے۔

عام طور پر مندرجہ ذیل شکلوں کے مینارے بنائے جاتے تھے:

۱- مربعہ: مربعہ شکل کے مینارے اسلام کی ابتدائی صدیوں کی یادگار ہیں، جن کو امویوں نے بلاد عربیہ کے مشرق و مغرب میں بنوایا تھا۔

۲- الاسطوانیہ (مدورہ): یہ طرز ان مسجدوں کے میناروں کا ہے جو عثمانیوں نے تعمیر کرائیں اس لئے یہ منارے ترکی میں بہ کثرت ہیں۔

۳- مضلعہ: اس طرز کے مینارے عبیدی عہد میں بنائے گئے اور اس کے نمونے بلاد شام و مصر کے سواحل پر موجود ہیں۔

۴- مدور مخروطی شکل: اس قسم کے مینارے عہد عثمانی میں ترکوں نے اپنے شہروں میں تعمیر کرائے تھے اور آج بھی وہاں اسی طرز کا تتبع ہوتا ہے۔

عالم اسلام کے جو مینارے اپنی عظمت و بلندی اور فنی خصوصیتوں کے لحاظ سے زیادہ ممتاز ہیں، ذیل میں ان کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے، یہ سب مسلمانوں کے اوج و اقبال اور ان کے اعلا تعمیری ذوق کی داستان اب بھی زبان حال سے سنا رہے ہیں:

قیروان کی جامع عقبہ بن نافع کا مینار: جب ہم عالم اسلام کے مغربی ملکوں کا رخ کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہماری نظر قیروان میں عقبہ بن نافع کی مسجد پر پڑتی ہے، یہ مسجد ۵۰ھ یعنی تقریباً پونے چودہ سو برس قبل تعمیر ہوئی ہے، اس کے ستونوں کا شمار اب آثار قدیمہ میں ہوتا ہے

اس کی برجی شکل کے مینار ہشام بن عبدالملک اموی کے گورنر بشر بن صفوان نے بنوائے تھے اور یہ قدیم ترین مینار آج تک موجود ہے، بنیاد سے اس کی کل اونچائی ۳۱ میٹر کے قریب ہے، بلاد مغرب کے اسلامی مینارے عام طور پر اسی جامع قیروان کے مینار کے طرز پر بنائے گئے ہیں، برجی شکل کے مینار حفاظت کے مقصد سے بنائے جاتے تھے اور ان کا استعمال عسکری دفاع کے لیے ہوتا تھا۔

جامع قرطبہ کا مینار: لسان الدین بن الخطیب کے بقول قرطبہ کا عظیم مینار عبدالرحمن الناصر نے بنوایا تھا، مقری نے ابن بشکوال سے مروی ایک روایت نقل کی ہے کہ عبدالرحمن نے ۳۴۰ھ میں بنائے گئے، مینار کو منہدم کرا کے ایک انوکھے طرز کا مینار بنوایا، اس نے اس کی بنیاد اس قدر گہری کھدوائی کہ پانی نکل آیا، پھر شہر "زہرا" سے وہاں اس کے ملاحظہ کے لئے گیا، اس کی ایک سیڑھی سے مینار میں داخل ہوا اور دوسری سے باہر آیا، پھر مقصورہ میں دو رکعت نماز ادا کی اور واپس چلا گیا، اس میں پہلے اندر داخلہ کا ایک ہی راستہ تھا، اس نے دو راستے بنوائے، ناصر کا تعمیر کردہ عالی شان مینار اپنے سنگ مرمر کی وجہ سے ممتاز ہے، اس کی اوپری چوٹی پر دو سونے اور ایک چاندی کا مصنوعی سیب ہے، طلوع آفتاب کے وقت جب ان مصنوعی سیبوں پر کرنیں پڑتی ہیں تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، اس میں چڑھنے اترنے کے لئے دو سیڑھیاں ہیں۔

جامع زیتونہ کا گنبد: گیارہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی جامع زیتونہ کی عمارت آج تک ویسی ہی قائم ہے، حوادث، زلزلوں اور متعدد جنگوں کے باوجود اس پر لکھی ہوئی تحریریں آج بھی تر و تازہ اور محققین و ماہرین کو ورطۂ حیرت میں ڈالے ہوئے ہیں، اس میں اور شہر تونس کی تاریخ تعمیر تحریر کی گئی ہے، بلاشبہ اس کے اہتمام و انصرام میں شہر تونس کے حکمرانوں اور گورنروں کا بڑا رول رہا ہے، بلاد غربیہ اور اہل تونس مینارے کو صومعہ کہتے ہیں، قدیم مورخین نے جامع زیتونہ کے ساتھ خاص اعتنا کیا ہے بعض نے کہا ہے کہ اسلامی فتوحات سے بہت پہلے اس کا گنبد راہبوں نے بنوایا تھا، اس جامع کی بنیاد حسان بن نعمان نے رکھی، عبیداللہ الحبحاب کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہوئی، مسجد زیتونہ اسلامی فن تعمیر کا عجیب اور حیرت انگیز دل کش نمونہ ہے، ایک معتبر تونسی فاضل کا بیان ہے کہ کسی زمانہ یا کسی ملک میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے، اپنی تعمیر کے بعد سے مختلف زمانوں میں اس میں توسیع و ترمیم اور اصلاح و اضافہ بھی کیا جاتا رہا ہے اور بعد کے دور میں اس

کی تزئین و آرایش بھی ہوتی رہی ہے، اگر مورخین و ماہرین آثار قدیمہ اس کی تاسیس و توسیع اور اصلاح و اضافے کی تاریخیں قلم بند کرتے تو ان کے اقوال مختلف و متضاد ہوتے لیکن اس کا ہر ریکارڈ مسجد کے پتھروں پر لکھا ہوا ہے، اس لیے کسی التباس و شبہ کی گنجایش ہی نہیں رہی۔

مصر کے مینارے: مصر کی جامع مسجد حضرت عمرو بن العاصؓ نے ۱۴ رصدی قبل تعمیر کرایا تھا جو آج تک موجود ہے، شہر قاہرہ قدیم تاریخی مساجد کا مجموعہ ہے، اسی لیے اس شہر کو "المدینة ذات الالف مئذنة" یعنی ہزار میناروں والا شہر کہا جاتا ہے، مصر کی انوکھی قدیم مسجدوں میں جامع احمد بن طولون کا بھی شمار ہوتا ہے، اس مسجد کی تعمیر میں خلیفہ متوکل کی بنوائی ہوئی شہر سامرا میں مسجد کے طرز کا تتبع کیا گیا ہے، اس میں دو مینارے مسجد کی پچھلی دیوار سے متصل ہیں اور دونوں میناروں میں حلزونی شکل کی سیڑھیاں باہر سے ہیں، مینارے بہت کشادہ اور عرض میں دوسرے میناروں سے ممتاز ہیں، مصر کی جامع ازہر کے میناروں کی بھی بڑی اہمیت ہے جس کا سنہ تاسیس ۳۶۱ھ / ۹۷۲ء ہے، اس میں شروع میں صرف ایک مینار تھا بعد میں اس میں پانچ مینارے بنائے گئے، پانچوں نمازوں کے اوقات میں مینارے سے موذن اذان دیتا تھا اور اسی سے لوگوں کو وقت بھی معلوم ہوتا تھا، اس کے علاوہ جامع ازہر کے صحن کی ایک دیوار پر بھی ایک دھوپ گھڑی لگی ہوئی تھی جو آج بھی موجود ہے، عہد ممالیک میں سلطان قایتبائی نے مدرسہ طبرسیہ اور مدرسہ اقبغاویہ کے درمیان واقع باب یمین پر ایک مینار تعمیر کرایا تھا، یہ تراشیدہ پتھروں سے بنا تھا، اس مینار سے متصل دو سروں والے مینار بھی ہیں جن کو سلطان غوری نے ۹۱۵ھ / ۱۵۱۰ء میں تعمیر کرایا تھا اور یہ آج بھی موجود ہیں، پھر قدیم محراب کے پیچھے دو مینارے عبد الرحمٰن کتخدا نے بنوائے، اس کے اضافے کے بعد جامع ازہر میں چھ مینار ہو گئے، سلطان ناصر بن قلاوون کے عہد حکومت میں امیر علاء اقبغا نے ایک مینار کا اضافہ کیا، تاہم باب مزینین کے داہنے جانب والے میناروں کو منہدم کرا دیا اور اب اس میں پھر پانچ مینارے رہ گئے، جامع حاکم کی تعمیر کا کام تو خلیفہ العزیز باللہ نے شروع کیا تھا، تاہم اس کی تکمیل حاکم بامر اللہ فاطمی (۴۰۳ھ / ۱۰۱۳ء) کے زمانے میں ہوئی، اس کے سامنے والے دونوں کناروں پر پتھر کے دو مینار ہیں، جامع میں داخل ہونے کا راستہ بیچ سے ہے، دونوں میناروں کے کچھ حصے ڈھ گئے اور جب ۷۰۲ھ کے زلزلے

میں ان کی دونوں چوٹیاں گر پڑیں تو آیندہ سال اس کی جگہ ایک گنبد بنا دیا گیا، جامع محمد ابی الذہب میں پانچ سروں والا گنبد ہے، اس جامع کا یہی امتیاز بھی ہے اور مرمریں گنبدوں میں جالیاں بھی ہیں، مسجد حسینی میں عصر فاطمی و ایوبی کے کچھ آثار باقی نہیں ہیں، سوائے باب اخضر اور اس بلند مینار کے جو عہد ایوبی کی انوکھی آرائش و زیبائش کا نمونہ ہے، مسجد سلطان حسن (۷۶۴ھ / ۱۳۶۳ء) میں دو عظیم مینارے ہیں جن میں ایک ۸۱ میٹر لمبا ہے، شروع میں اسے مسجد میں چار مینار بنانے کا خیال تھا لیکن جب تیسرا تعمیر ہی کے دوران ڈھ گیا تو سلطان نے دو ہی میناروں پر اکتفا کیا۔

فلسطین و شام کے مینار: فلسطین میں میناروں کی تاسیس و تعمیر کا کوئی اپنا الگ طرز نہیں ہے، وہاں زیادہ تر مصری طرز کے مینارے بنائے گئے ہیں اور عام طور پر مربع (چوکور) میناروں کا چلن ہے، مسجد اقصیٰ اپنی شکل میں آج بھی ویسی ہی ہے، اس کا موجودہ ڈھانچہ خلیفہ عباسی مہدی کا تعمیر کردہ ہے، خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے حرم مقدس سے متصل صخرہ پر ایک مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا جس پر گنبد تعمیر کیا گیا تھا، شام کی اموی جامع مسجد ایسے علاقے میں تعمیر کی گئی، جہاں زیادہ تر قدیم بت خانے تھے جن میں برج ہوتے تھے، مسلمان انہیں اذان کے لیے استعمال کرنے لگے، معاویہ بن ابی سفیان کے زمانے میں رومانی معبد پر جو مسجد تعمیر کی گئی تھی ان کے بعد مسلمانوں نے اس کی عمارت کا فائدہ اٹھایا اور اسے جامع مسجد کی شکل دے دی، کچھ برسوں کے بعد انہوں نے برجوں کے اوپر لکڑی کی چھتریاں بنوا دیں جس کے سائے میں موذن اذان دیتا تھا، عبد الملک بن مروان نے جب جامع اموی کی نئی تعمیر کرائی تو اس کی وہی صورت باقی رکھی، میناروں کے اوپر چھتریوں کا بھی اضافہ کیا گیا، اس کے بعض اجزا آج بھی باقی ہیں۔

عراق اور الجزیرہ کے معماروں نے میناروں کا الگ طرز ایجاد کیا جو سامرا اور ابودلف کے طرز کے تھے، موصل میں جامع نوری کا مینار بھی ممتاز میناروں میں ہے، جس کی تعمیر ۵۴۳ھ کے قریب نور الدین محمود اتابکی کے عہد میں ہوئی تھی۔

(ماخوذ: مجلة الحج والعمرة، اپریل ۲۰۰۶ء)

ک۔ ص۔ اصلاحی

معارف کی ڈاک

پروفیسر خورشید الاسلام اور چند دوسرے

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج
پوسٹ باکس بسوریا، وایا لوریا
مغربی چمپارن، بہار
۱۶/اکتوبر ۲۰۰۶ء

مخدومی و محترمی !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں ستمبر میں علی گڑھ گیا تھا، پروفیسر مختار الدین احمد سے پروفیسر خورشید الاسلام کی وفات پر معارف کے تاثرات کا ذکر آیا تو انہوں نے خورشید الاسلام صاحب کو ملحدانہ تصورات کا حامل قرار دیا اور یہ واقعہ بیان کیا کہ ”ان کے یہاں سے ایک بار پروفیسر اسلوب احمد انصاری اس لئے چلے گئے تھے کہ جس محفل میں ایسا منکر خدا اور رسول موجود ہو میں وہاں نہیں جا سکتا“۔

عرصہ ہوا ”چٹان“ کے کسی شمارے میں پڑھا تھا کہ لاہور کے ایک ہوٹل میں اختر شیرانی مرحوم نشہ شراب میں مست ہو کر بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے، چند بے دین، اشتراکی شعرا کو شرارت سوجھی، چنانچہ انہوں نے فیض احمد فیض، جوش اور ارسطو اور سقراط کے بارے میں اختر شیرانی مرحوم سے ان کے خیالات معلوم کرنا چاہا، اختر شیرانی مرحوم نے ان سب کے بارے میں توہین آمیز کلمات استعمال کئے، آخر میں ایک شاعر پوچھ بیٹھا کہ محمد عربی ﷺ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اس پر وہ غصے میں بپھر گئے، زار و قطار رونے لگے، شراب کا نشہ کافور ہو گیا، شراب کا پیالہ اٹھایا اور سوال کرنے والے کے سر پر زور سے مارا، پھر سوال کرنے والے سے کہا:

”اے بے شرم و بے حیا! تمہیں یہ کیسے جرأت ہوئی کہ تم نے اس ناپاک محفل میں اس ذات اقدس ﷺ کا نام لیا؟ تم اس سوال سے توبہ کرو، میں ہزار گنہگار سہی لیکن راسخ العقیدہ مسلمان ہوں، پھر روتے ہوئے وہ اس ہوٹل سے نکل گئے“۔

ایک روز ڈاکٹر سید امین اشرف صاحب نے فرمایا:

”ڈاکٹر معین احسن جذبی اور پروفیسر خورشید الاسلام دونوں اشتراکی اور ترقی پسند شاعر و ادیب تھے لیکن دونوں میں نمایاں فرق تھا، جذبی صاحب سے اسلام اور توحید و رسالت کے خلاف کوئی بات نہیں سنی گئی، وفات کے وقت جذبی صاحب نے اپنے بیٹے کو بلایا اور کہا:

”میں گناہ گار ہوں، مجھے اپنی کوتاہی عمل کا اعتراف ہے لیکن میں مسلمان ہوں، میں تجھے گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ مجھے اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر پختہ ایمان ہے“۔

پروفیسر خورشید الاسلام نے ہمیشہ توحید و رسالت کا مذاق اڑایا، ان کے بیٹے طارق الاسلام کا کہنا ہے کہ ان کے والد آخری دم تک دین اسلام کی طرف نہیں پلٹے تھے۔

والسلام
طالب دعا
وارث ریاضی

”رند پارسا“

مبارک اردو لائبریری
محمد آباد تحصیل صادق آباد
۶/نومبر ۲۰۰۶ء

”رند پارسا“، عقیل احمد نہیں رئیس احمد جعفری کی تصنیف ہے، ریاض خیر آبادی ان دونوں بھائیوں کے نانا تھے۔(۱)

خاکسار
انیس شاہ جیلانی

(۱) دیکھئے معارف اکتوبر، ص ۳۰۵، مکتوب محمد حامد علی صاحب، گورکھ پور۔

ادبیات

قطعہ تاریخ بنیان گذاری
دانش گاہ محمد علی جوہر در شہر رام پور

از:- ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی☆

چو خواندم ایں خبر در روز نامہ — کہ از توفیق و تائیدات داور
بہ شہر رام پور، استانِ یوپی — بنا گردید دانش گاہِ جوہر
زبان شوقِ من بر خواند، وردم — بحمد اللہ و پس اللہ اکبر
نوشتم ارتجالا بیت ہای — کہ دارد معنی بسیار دربر
ز چندیں سال، مساعی بود اعظم[1] — کنون گردید سعیِ او ثمرور
نہادہ سنگ بنیادش ملائم[2] — بہ روزِ ھجدہ از ماہِ ستمبر
بہ یمن پای مولانای رابع[3] — مسِ خامش شدہ مانندۂ زر
در انجا کسب دانشہا نمایند — بتنہایی نہ فرزندان کشور
امیدم ہست، از گلہای دانش — کند ایں باغ، دنیا را معطر
دعا گویم کہ ایں بنیان زیبا — نبیند تا قیامت روزِ ابتر
نگہدارد ز دستِ بدنہادان — بہ فضل و رحمت خود رب اکبر
چو کردم جستجوی سال تاسیس — برای ایں بنای طرفہ منظر
رئیس از گوشہ ہای خاطر من
ندا آمد: ''ہزار و سہ'' مکرر
1003 X 02 =
2006

[1] اعظم خان۔ [2] ملائم سنگھ یادو۔ [3] مولانا محمد رابع حسنی ندوی۔

☆ پوسٹ باکس نمبر-۱۱۴، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔

مطبوعات جدیدہ

آغوش آمنہؓ سے رفیق اعلی تک: از جناب مولانا مظفر حسن ادیبی مبارک پوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۸، قیمت ۱۳۵ روپے، پتہ: ڈاکٹر مولوی نثار احمد، دی انصار ہومیو ہال، پورہ رانی، مبارک پور، اعظم گڈھ۔

جناب ظفر ادیبی مرحوم کی شہرت ایک کامیاب خطیب و مقرر کی تھی لیکن عمر کے آخری دور میں انہوں نے اپنی تصنیفی صلاحیت کا مظاہرہ بھی خوب کیا، ان کی کئی کتابوں کا ذکر پہلے بھی کیا جاچکا ہے، زیر نظر کتاب سیرت شاید ان کی آخری کتاب ہے اور حسن خاتمہ کی دلیل و مبشر بھی، انہوں نے انتہائی ضعف و ناتوانی کے عالم میں یہ ضخیم سیرت مرتب کی، مقصد بھی واضح تھا کہ ''سیرت کا پیغام عالم انسانیت کے نام'' کہ سیرت رسول اللہ ﷺ ایک ملک و قوم کے لیے ہی ذریعہ ہدایت نہیں بلکہ پورے عالم انسانی کے لیے رشد و ہدایت کا مکمل پیغام ہے، اس مبارک تالیف میں طرز وہی قدیم ہے کہ پہلے عرب اقوام، نجران میں عیسائیت کی ابتدا، صاحب اخدود ذی نواس، عرب کا دور جاہلیت وغیرہ پر اظہار خیال ہے اور پھر حجۃ الوداع تک سیرت کے تمام پہلوؤں کو بیان کیا گیا، خوبی یہ ہے کہ اسلوب بہت سلیس ہے، خطیبانہ انداز بھی جابجا نمایاں ہے، جس سے تفہیم میں آسانی آئی اور اثر کی خاصیت بھی، سیرت پاک کے موضوع پر یہ نمائندہ کتابوں کی فہرست میں ضرور شامل کی جائے گی۔

فکر اسلامی کے فروغ میں شیخ احمد سرہندی کی خدمات: مرتبہ پروفیسر عبدالعلی اور پروفیسر ظفر الاسلام، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۰، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ-۲۔

مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ نے ۲۰۰۴ء میں شیخ احمد سرہندی کی یاد تازہ کرنے کے لئے ایک یادگار سمینار منعقد کیا تھا، خاص مقصد یہ تھا کہ فکر اسلامی کے ارتقا میں شیخ سرہندی کی خدمات کو از سر نو منظر عام پر لایا جائے، حکومت اور عوام دونوں میں اسلامی تعلیمات یا شریعت کے قوانین کا

احیااور دین میں غلط تصورات ونظریات اور ان کی بنیاد پر رائج بدعات کا خاتمہ حضرت شیخ سرہندی کی زندگی کا سب سے نمایاں عنوان ہے اور اسی بناپر ان کے معتقدین نے ان کو الف ثانی کا مجدد بھی قرار دیا، اس سیمینار کے موضوعات کے دائرے نے اپنی وسعت میں شریعت، تصوف، مکتوبات و نگارشات اور جملہ کارناموں کو گوشامل کیا لیکن زیادہ توجہ تصوف اور اس کے نظریات وحدت الوجود ووحدت الشہود پر رہی، پہلا اور کلیدی مقالہ ڈاکٹر عبدالحق انصاری کا اسی موضوع پر ہے اور اس نے گویا بعد کے مقالات کا نہج بھی متعین کردیا، ان کے نزدیک مجدد الف ثانی کا ادراک تصوف خود ان کے الفاظ میں ان کے وجود کی غایت تھا اور اسکا پہلا اظہار جلال الدین اکبر کے فتنہ الحاد کے ازالہ کی شکل میں ہوا، ایک کارنامہ یہ بھی بتایا گیا کہ وجودی تصوف کی بے اعتدالیوں کو درست کرنے کے لئے شیخ سرہندی کے خلفا اور مریدوں نے پورے ملک میں نقش بند یہ سلسلہ کی بڑے پیمانے پر اشاعت کی اور سب سے غیر معمولی کارنامہ یہ بھی ہے کہ تصوف کے تمام پہلوؤں کا ایک ساتھ جائزہ لیا گیا اور چوں کہ یہ جائزہ عظیم القدر صوفی نے انجام دیا تو بقول ڈاکٹر انصاری ''اس کا ایک ہی مقصد ہوگا، تصوف کی قرآن وسنت کی روشنی میں اصلاح اور تجدید'' بعد کے مقالات میں ان ہی خیالات کی تکرار ہے گو پروفیسر ظفر الاسلام نے تصوف کی جگہ اسلامی فکر اور شریعت کی ترویج کو رکھنا زیادہ پسند کیا ہے، انہوں نے مکتوبات شیخ کی مدد سے اپنے مطالعہ کو مدلل کیا ہے لیکن آخر میں وہ اس سوال کے جواب کو کسی الگ بحث کے حوالے کرنے پر مجبور ہوئے کہ حضرت شیخ کی اصلاحی تحریک حکومت وقت کے مزاج وآہنگ میں کس حد تک تبدیلی پیدا کرسکی؟ پروفیسر یسین مظہر صدیقی کی نظر میں بھی مجدد الف ثانی کا سب سے عظیم کارنامہ شریعت وطریقت کی کامل ہم آہنگی اور تعامل ہے، حالاں کہ بقول ان کے ''اس تعامل میں بڑا فرق ہے، اس میں ایک مثال کشف والہام صوفیہ کی ہے جس کی قطعیت پر کلام کیا گیا ہے، شیخ سرہندی کے بعد شاہ ولی اللہ کے یہاں حضرت شیخ کے تعامل کا اثر کم ہی دکھائی دیتا ہے کہ وہ کشف والہام میں خطا کے قائل نہیں جب کہ شیخ سرہندی کے نزدیک خطا کا امکان بہر حال ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ الہام (صوفی) انکار کی گنجائش نہیں رکھتا تاہم وہ دوسروں کے لیے حجت بھی نہیں، خود شیخ سرہندی کے معاصر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بعض شکوک وشبہات کا اظہار ہی نہیں اعتراض بھی کیا تھا، مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب معارف

نے اسی موضوع پر اظہار خیال کیا، ڈاکٹر رضی الاسلام نے مولانا سید احمد عروج قادری کی تحریروں کے سائے میں تصوف سرہندی کے تنقیدی مطالعہ کی ہمت کی، دوسرے مقالات بھی اہم ہیں اور ان سب نے مذاکرہ علمی کی اصل فضا قائم کرنے میں بڑی مدد کی ہے، ایک عرصے کے بعد حضرت مجدد الف ثانی کی یادوں کی تجدید ہوئی اور یقینا ایک شان سے ہوئی۔

غالب: از جناب غلام رسول مہر مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وکتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۷۸، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی-۲۔

غالبیات پر بے شمار کتابوں کے ذخیرہ وانبار میں جن کتابوں کو ہر دور میں اہمیت حاصل رہی ان میں حالی کی یادگار غالب کے ساتھ مولانا غلام رسول مہر کی غالب بھی ہے، خصوصاً سوانح غالب کے باب میں اس کتاب کو فضل تقدم حاصل ہے، انہوں نے ۱۹۳۶ء میں یہ کتاب سپرد قلم کی تھی، ۱۹۴۱ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن لاہور سے شائع ہوا تو انہوں نے اس میں خاصی تبدیلیاں کیں اور لکھا کہ بہ اعتبار مطالب یہ پہلے سے بہتر صورت میں ہے، اس میں انہوں نے یہ بھی لکھا کہ اس تالیف کا موضوع غالب کے سوانح حیات کے سوا کچھ نہ تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ کتاب غالب کی تزک ہے، شاعری اور انشا پردازی پر تبصرہ بہت کم ہے، اس لئے کو دلآویزی اور رعنائی میں یہ یادگار غالب سے فروتر ہے لیکن تحقیق وتلاش کے لحاظ سے یہ بلند پایہ ہے اور یہ کہنا بجا ہے کہ غالب کے جزوی حالات کے متلاشیوں کے لیے یہ بہت مفید ہے. بعد کے ایڈیشنوں میں مہر مرحوم کے ممدوح مولانا ابوالکلام آزاد کے بعض حواشی بھی اس کتاب کی زینت بنے، بقول مہر ''یہ معلومات کا نہایت قیمتی ذخیرہ ہیں''، زیر نظر کتاب کا طبع جدید اس مقصد کے تحت ہے کہ ''غالبیات کے اس سرمائے کی بازیافت کرنا جو وقت گزرنے کے ساتھ گم ہوگیا یا اگر کہیں ہے بھی تو اس تک رسائی آسان نہیں''، غالب انسٹی ٹیوٹ اس نیک مقصد اور اس طبع نو کے لئے شکریے کی مستحق ہے، البتہ اس میں پرانے ایڈیشنوں کی تمہیدات کو شامل نہیں کیا گیا اور اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی گئی، شروع میں مالک رام کی تذکرہ معاصرین سے مہر صاحب کے مختصر حالات ضرور نقل کئے گئے ہیں اور پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کے قلم سے ایک مختصر تعارف بھی ہے،

بہتر ہوتا کہ جس قدیم ایڈیشن سے عکس لیا گیا ہے اس کا ذکر کر دیا جاتا۔

تحفۂ حج: از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۵۶، قیمت ۱۸۰ روپے، پتہ: مکتبہ رشیدیہ، بالمقابل مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی، پاکستان۔

اس سفرنامۂ حج کے فاضل مصنف نے ایک عرصے سے اردو ادب و تاریخ کو علمی، تاریخی، تحقیقی اور دستاویزی کتابوں سے پر ثروت بنا رکھا ہے، ۲۰۰۳ء میں ان کو حج کے سفر کی سعادت ملی اور اس یقین کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ نے ویسا ہی کیا جیسا اس کے بارے میں ایک مومن بندے نے گمان کیا تھا، ان کا یہ احساس بھی قابل ذکر ہے کہ اس سفر سے واپسی میں وہ اپنے اعزہ و مخلصین کے لیے شایان شان تو کیا معمولی سوغات بھی نہ لا سکے لیکن حقیقت یہی ہے کہ پیش نظر تحفۂ حج سے بڑھ کر اور کیا سوغات ہو سکتی ہے، یقیناً حج و زیارت کے سفر کی یادگار بننے اور عرصے تک باقی رہنے والی کوئی چیز ہے تو یہی تحفہ ہے، یہ سفرنامہ اصلاً ڈائری کی شکل میں ہے، یہ صحیح ہے کہ بعض دوسرے سفرناموں کی طرح اس میں مسائل، فضائل اور دعاؤں کی کثرت نہیں لیکن مسافر کے تاریخی ذوق کی کارفرمائی بڑے مفید و موثر انداز میں نظر آتی ہے، آثار متبرکہ کے ذکر میں انہوں نے شعوری طور پر قاری کے ذہن و فکر کو واقعات کی جانب موڑ دیا ہے، جدہ سے مکہ مکرمہ تک کے سفر کے احوال میں انہوں نے علامہ شبلی اور ڈاکٹر حمید اللہ کی تحریروں کی مدد سے جس طرح صلح حدیبیہ اور غزوۂ بدر کی تصویر کشی کی ہے یا دوسرے مآثر کے بیان میں ان کا تاریخی پس منظر باتوں باتوں میں بیان کیا ہے اس سے اس تحفۂ حج کی انفرادیت ثابت ہوتی ہے، تحریر کی سادگی اس تحفۂ حج کی بڑی خوبی ہے، جس نے احوال میں عجب تاثیر پیدا کر دی ہے، ایک بزرگ قاری شریف احمد کے ذکر میں بڑی معصومیت سے لکھا کہ "کاش میرے بھی ایسے باپ دادا ہوتے اور ان کی نسبت پر فخر کرتا میں بھی اپنے نام کے ساتھ شریفی لکھ سکتا لیکن یہ شرف بازار کی چیز نہیں کہ خرید لاؤں، یہ سعادت الٰہی ہے اور خدائے بخشندہ جس کو چاہے بخش دیتا ہے"، آخر میں حج و عمرہ سے متعلق چند ضروری اصطلاحوں کی تفصیل ہے، جا بجا تصویریں بھی ہیں اور بعض تو بہت اہم ہیں، سفرناموں خصوصاً حج کے سفرناموں میں یہ سفرنامہ واقعی ایک عمدہ اضافہ اور خوش نصیب عازمین حج کے لیے بہترین تحفہ ہے۔

خطبات حرم: از شیخ محمد بن عبداللہ السبیل، مترجم جناب ابوالمکرم عبدالجلیل، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۹۰، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ سلفیہ بی ۱۸/۱ جی، جامعہ سلفیہ مارگ، ریوڑی تالاب، بنارس، یوپی۔

خانہ کعبہ کی عظمت و حرمت کا اثر اس سے منسوب و متعلق ہر شے پر قدرتی و فطری ہے، شہر حرم ہو یا ارض حرم یا باشندگان حرم، تقدس اور پاکیزگی تو اس کے ذروں ذروں میں نمایاں ہے اور امام حرم کے رتبہ کا کیا کہنا، خصوصاً امام ابن السبیل جن کی شخصیت اور پراثر خطبوں اور تقریروں سے ہندوستان کی فضائیں بھی مانوس ہیں، وہ کئی بار ہندوستان تشریف لائے اور اب حرم شریف میں ان کے خطبات کا یہ اردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے، جمعے کے ان خطبات کی خوبی یہ ہے کہ یہ مختصر ہونے کے باوجود، وقت اور موقع کی مناسبت سے بڑے جامع ہیں، قریب پچاس خطبے ہیں اور یہ تمام ترغیب اور جا بجا ترہیب کے موضوعات پر ہیں، برجستگی اور لہجہ و اسلوب کی اصل لذت تو ظاہر ہے اصل زبان ہی میں ہے تاہم لائق مترجم نے کوشش کی ہے کہ نقل مطابق اصل ہو اور اس میں وہ کامیاب بھی ہیں، ہمارے جمعہ کے خطیبوں کے لیے یہ خاص طور پر ایک عمدہ تحفہ ہے۔

مضامین ہفت رنگ: از جناب محبوب الرحمن فاروقی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۳۲، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: ابلو والیہ بک ڈپو ۹۹۸۸/۴۵، نیو روہتک روڈ، دہلی اور مکتبہ جامعہ وغیرہ۔

اس مجموعہ مضامین کے مولف کی علمی و ادبی صلاحیتوں کی نشو و نما تو ان کے قابل قدر خانوادے کی دین ہے لیکن اصل قوس قزح، ماہنامہ "آج کل" کے افق پر ظاہر ہوئی، ان کے اداریوں نے اس سرکاری رسالے کی مقبولیت میں ایسا اضافہ کیا کہ ماضی میں اس رسالے کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، وہ قریب تیرہ برس تک "آج کل" کے مدیر رہے اور دنیائے صحافت کو اپنا مرید بناتے رہے، اس عرصے میں انہوں نے جرأت، بے باکی اور حق گوئی کا بھی حق ادا کیا، اداریوں کے علاوہ ان کی اور مفید اور پر از معلومات تحریریں بھی رسالے کی زینت بنتی رہیں، زیر نظر مجموعہ میں ان تحریروں کا ایک انتخاب پانچ ابواب میں سلیقے سے پیش کیا گیا ہے، اردو اور روزی روٹی، اردو اور مقابلہ جاتی امتحانات کے علاوہ باب اول میں مولانا عبدالسلام ندوی، جوش ملیح آبادی،

دلیپ سنگھ اور شمس الرحمن فاروقی پر مضامین ہیں، چند نوبل انعام یافتہ ادیبوں اور شاعروں مثلاً مارس ماترلیک، شیم بورسکا، ڈاریو فو، گوشنگ پنگ اور نائپال وغیرہ پر ان کی تحریریں اردو والوں کے لیے نئی بھی ہیں اور وقیع بھی، ایک باب میں سائنس کے متعلق پرازمعلومات مضامین ہیں، بعض ترجمہ ہیں لیکن بہت سلیس اور شگفتہ انداز میں، ان سے فاروقی صاحب کی سائنس سے دل چسپی کے علاوہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مستقل اس موضوع پر اردو کے سرمایے کو مالا مال کرنے کے لیے موزوں ترین اہل قلم ہیں، محاورات ہند، حفیظ جون پوری کی انتخاب غزلیات پر ان کی تعارفی تحریریں بھی خاصے کی چیز ہیں، بعض شخصیات پر ان کی تعزیتی تحریریں آخری باب میں شامل ہیں، اس طرح مسرت اور بصیرت اور لطف ولذت اور صحیح وصائب علم وفکر کے رنگوں کا یہ اسم بامسمی مجموعہ ہے۔

انیسویں صدی کے اردو اخبارات: از ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ وکتابت وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۷۰، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: رام پور رضا لائبریری، حامد منزل، قلعہ، رام پور، یوپی۔

بیسویں صدی میں اردو صحافت کے ارتقا وفروغ سے واقفیت کسی نہ کسی درجے میں عام ہے لیکن انیسویں صدی میں اردو صحافت کی تاریخ شاید سب سے زیادہ پردۂ خفا میں ہے، اس قابل قدر کتاب کے انتھک مولف کے بقول واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی میں شائع ہونے والے اخبارات ورسائل کی تعداد چار سو سے زیادہ ہے، اب ان میں سے کم ہی کہیں محفوظ ہیں، اکثر کے تو نام سے بھی واقفیت نہیں، اسی احساس کے پیش نظر یہ خیال کیا گیا کہ انیسویں صدی کے اخبارات کی ایک فہرست ہو جو ہند وپاک کے کتب خانوں کی مدد سے تیار کی جائے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کس اخبار کا کون سا شمارہ کہاں مل سکتا ہے، قریب پندرہ سال کی مسلسل محنت اور تلاش وجستجو کے بعد زیر نظر اشاریہ سامنے آیا جس میں ہندوستان کے چوبیس کتب خانوں سے استفادے کے بعد سو سے زیادہ اخباروں کا اشاریہ حروف تہجی کے اعتبار سے بنایا گیا، نام، مقام اشاعت، مدت اشاعت مالک، مہتمم، جلد نمبر، شمارہ نمبر، تاریخ اشاعت کی وضاحتوں کے ساتھ اب جس کتب خانے میں یہ دست یاب ہیں اس کی رہنمائی بھی کی گئی، اس محنت اور عرق ریزی کی داد دینی ہوگی، رضا لائبریری بھی اس کی عمدہ اور شایان شان اشاعت کے لیے مستحق تحسین ہے۔

ع۔ص